Registered No. L. 4185

جلد ۲۲ - عدد ۳، ۴

ربیع الاول / ربیع الآخر ۱۳۶۲ھ

۴۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دارالاسلام جمال پور، پٹھانکوٹ

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قیمت سالانہ

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت، قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت مجلد ۳ روپے علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات } یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنہیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب ان سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ان اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضخامت ۳۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/-/۲ علاوہ محصولڈاک

فہرست مضامین

بابت ماہ ربیع الاول و ربیع الآخر سنہ ۶۲ھ —— اپریل سنہ ۴۳ء) جلد ۲۲ عدد ۳-۴

چونکہ تمام خریداروں کے نمبر خریداری تبدیل کر دیے گئے ہیں اس لیے خریداران ترجمان القرآن" سے گذارش ہے کہ اپنے جدید نمبر خریداری کو (جو چٹ پر درج ہے) نوٹ فرمالیں اور آئندہ خط وکتابت میں نمبر کا حوالہ ضرور دیدیا کریں۔ نیز جو اصحاب منی آرڈر کے ذریعے سے اپنا چندہ ارسال فرمائیں وہ کوپن پر اپنا پورا پتہ معہ نمبر خریداری درج کرنے کا التزام فرمائیں۔ جو حضرات نمبر خریداری کا حوالہ نہ دیں گے اُن کی شکایات دُور کرنے میں دفتر معذور رہے گا۔

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر، گیلانی الیکٹرک پریس، ہسپتال روڈ۔ لاہور میں طبع ہو کر

دفتر ترجمان القرآن"۔ دارالاسلام پٹھانکوٹ سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

یہ پرچہ پھر دو ماہ کا یکجائی شائع کیا جا رہا ہے۔ گذشتہ ماہ جنوری میں ہم نے حیدر آباد کے جدید کارخانہ کاغذ سازی سے اس رسالہ کی ضروریات کے لیئے ڈیڑھ سال کا اکٹھا ذخیرہ خرید لیا تھا لیکن جنگی حالات کی وجہ سے اب تک اس ذخیرہ کو حیدر آباد سے یہاں منتقل کرنے کا انتظام نہیں ہو سکا ہے اور کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی کہ کب تک ہو سکے گا۔ مارچ کا پورا مہینہ اسی انتظار میں گذر گیا کہ کاغذ آئے تو پرچہ شائع ہو۔ آخر جب اپریل کا بھی ایک ہفتہ گذر گیا تو مجبوراً ہمیں پھر "چور بازار" کی طرف رجوع کرنا پڑا جو موجودہ نظام سیاسی و معاشی کے سب سے زیادہ قابلِ لعنت مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ یہ بازار جن کے نظ[...]ق کی بدولت وجود میں آیا ہے وہ اسے کالی منڈی (بلیک مارکیٹ) سے تعبیر کرتے ہیں مگر فی الواقع یہ کالی منڈی دن کی پوری روشنی میں، پولیس اور عدالت اور سکرٹریٹ اور گورنمنٹ ہاؤس کے عین پہلو میں رونق افروز ہے اور اس میں ہندوستان کا سرمایہ دار علی الاعلان احتکار کر کے دس اور بارہ گنی زیادہ قیمت پر مال فروخت کر رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے اگر اس پر کوئی قدغن ہے تو اس لیے نہیں ہے کہ یہ منڈی بند ہو جائے بلکہ اس لیے ہے کہ جو بدبخت اس میں جا پھنسے وہ صرف نقصان مایہ ہی برداشت نہ کرے بلکہ اس سے مال حاصل کرنے کے لیے وہ تدابیر بھی اختیار کرے جو اس کے اخلاق اور اس کی شرافت کو بھی مجروح کر دیں۔ پچھلے دو پرچے شائع کرنے کے لیے ہم کو اس منحوس بازار سے کاغذ حاصل کرنے کی جو کوششیں کرنی پڑی تھیں ان کی یاد اتنی تلخ تھی کہ پھر ایک بار اس کی طرف رجوع کرنا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہنم سے نکل کر [...]م کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن یہ محض اپنی دعوت کو زندہ رکھنے کی خواہش ہے جو دوبارہ ہمیں اس "کوچہ رقیب" میں لے گئی ہے اور اب ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اپنے فضل سے ہمارے لیے کم از کم اتنی سہولتیں پیدا فرما دے کہ ہم اس نظام تمدن کی گندگیوں سے بچ کر اس دعوت کو جاری رکھ سکیں۔

ہمیں احساس ہے کہ ۸۰ صفحہ کے بجائے ۳۲ صفحہ کا پرچہ پاکر ناظرینِ رسالہ کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی، خصوصاً جبکہ اس کا معیار بھی رسالہ کے سابق معیار سے بہت گرا ہوا ہے۔ لیکن جو حالات اس وقت درپیش ہیں ان کو دیکھتے ہوئے ہم کو توقع ہے کہ ناظرین صبر سے کام لیں گے۔ اس وقت جس گراں قیمت پر ہم کاغذ خرید رہے ہیں اس کی وجہ سے ۳۲ صفحہ کے پرچہ کی لاگت قبل جنگ کے ۸۰ صفحہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم اگر حیدرآباد کا کاغذ آجائے تو ۳۲ کے بجائے ۴۸ صفحات پر رسالہ شائع کرنا ممکن ہوگا۔

اپنی مطبوعات کی قیمتوں میں بھی ہم کو بادلِ ناخواستہ غیر معمولی اضافہ کرنا پڑا ہے کیونکہ اس کے بغیر لٹریچر کی اشاعت کا سلسلہ جاری نہیں رکھا جاسکتا۔ پہلے کا طبع شدہ ذخیرہ تقریباً ختم ہوچکا ہے۔ دوبارہ کتابیں طبع کرانے کے لیے "برطانوی ہندوستان" میں کاغذ فراہم ہونا محال ہے۔ ناچار یہ انتظام کیا گیا ہے کہ تمام کتابیں حیدرآباد میں طبع کرائی جائیں اور پھر بتدریج ان کو یہاں منتقل کیا جائے۔ اس صورت میں مصارفِ طباعت اس قدر زیادہ ہوجاتے ہیں کہ سابق قیمتوں کو برقرار رکھنا قطعاً غیر ممکن ہے۔

"جماعتِ اسلامی" کی رفتارِ ترقی معلوم کرنے کے لیے بیرونی ارکان کی طرف سے اکثر بے چینی کا اظہار کیا جارہا ہے اور یہ بے چینی ایک حد تک فطری ہے۔ میں اب تک اس اندیشہ سے اس کو نظر انداز کرتا رہا ہوں کہ کہیں ہمارے کام میں بھی نمائش اور اشتہار کا عنصر داخل نہ ہوجائے اور اللہ کے لیے کام کرنے کے بجائے ہم دنیا کو دکھانے کے لیے کام نہ کرنے لگیں۔ مگر آج محض اس خیال سے اس کا ذکر کرتا ہوں کہ جو رفقاء مرکز سے دور بیٹھے ہیں اور جن کو معلوم نہیں ہے کہ کام کس رفتار سے ہورہا ہے، کہیں ان پر مایوسی طاری نہ ہونے لگے۔

جماعت کے ارکان کی تعداد اس وقت سات سو کے قریب ہے۔ بیرونی جماعتوں کی طرف سے اب تک پوری فہرستیں نہیں آئی ہیں اس لیے صحیح تعداد متعین نہیں ہوسکتی۔ ممکن ہے کہ اصل تعداد اس تخمینہ سے زیادہ ہی ہو۔

سندھ، بلوچستان، سرحد، بنگال، بمبئی اور وسطِ ہند کے علاقے ابھی تک ہماری دعوت سے بہت بیگانہ ہیں۔ زیادہ تر

جن علاقوں نے اس کا اثر قبول کیا ہے وہ پنجاب، یوپی، بہار، دکن اور مدراس کے علاقے ہیں۔

جہاں تک لٹریچر کی اشاعت اور ارکان جماعت کے کام کی رپورٹوں سے اندازہ کر سکا ہوں، پچھلے ڈیڑھ دو سال میں ہم تقریباً ایک لاکھ آدمیوں تک اپنی آواز پہنچا چکے ہیں اور ان میں سے کم از کم دس فی صدی حصہ ہماری دعوت سے متاثر ہو چکا ہے۔ غیر مسلموں میں ابھی دعوت کا کام بمنزلۂ صفر ہے، لیکن جو تھوڑی سی کوشش اس سلسلہ میں کی گئی ہے اس کے نتائج مایوس کن نہیں ہیں۔ اس سے اتنا اندازہ تو ضرور ہو گیا کہ غیر مسلم قوموں میں مسلمانوں کے خلاف جو تاریخی اور قومی تعصبات پائے جاتے ہیں وہ انشاء اللہ ہماری اس دعوت کی راہ میں کوئی بڑی رکاوٹ نہ بن سکیں گے۔ عوام اور دیہاتیوں اور محنت پیشہ طبقوں میں بھی ابھی تک کسی بڑے پیمانے پر کام شروع نہیں ہو سکا ہے۔ اس سلسلہ میں ابھی میں خود بھی ابتدائی تجربات کر رہا ہوں اور بعض دوسرے رفقاء بھی اپنے اپنے مقام پر مختلف طریقوں سے کام کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ کچھ زیادہ مدت نہ گزرے گی کہ ان تجربات سے ہم عوام میں تبلیغ کرنے کا ایک مناسب ترین ڈھنگ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

دعوت کے لیے اب تک ہم زیادہ تر اُردو زبان ہی کو وسیلہ بناتے رہے ہیں اور دوسری زبانوں سے کچھ زیادہ کام نہیں لے سکے ہیں، لیکن انگریزی، ترکی، ہندی، ٹامل، تلنگی اور ملیالم میں لٹریچر کی تیاری کے لیے عملاً کوشش شروع ہو چکی ہے اور اگر اللہ کا فضل شامل حال رہا تو جنگ کے بعد ہم ہندوستان اور بیرونِ ہند میں ان زبانوں کے واسطے سے خیالات کی اشاعت شروع کر دیں گے۔

سب سے بڑی چیز جو ہمارے نزدیک ہر دوسرے نتیجہ سے زیادہ قیمتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دعوت کا اثر جہاں جہاں بھی پہنچا ہے، اس نے مردہ ضمیروں کو زندہ اور سوتے ہوئے ضمیروں کو بیدار کیا ہے۔ اس کی اولین تاثیر یہ ہوئی ہے کہ نفس اپنا محاسبہ آپ کرنے لگے ہیں۔ حلال اور حرام، پاک اور ناپاک، حق اور ناحق کی تمیز پہلے کی محدود مذہبیت کی بہ نسبت اب بہت زیادہ وسیع پیمانہ پر زندگی کے تمام مسائل میں شروع ہو گئی ہے۔ پہلے جو کچھ دینداری کے باوجود

کر ڈالا جاتا تھا وہ اب گوارا نہیں ہوتا بلکہ اس کی یاد بھی شرمندہ کرنے لگی ہے۔ پہلے جن لوگوں کے لیے کسی معاملہ کا یہ پہلو سب سے کم قابل توجہ تھا کہ یہ خدا کی نگاہ میں کیسا ہے ان کے لیے اب یہی سوال سب سے زیادہ مقدم ہوگیا ہے۔ پہلے جو دینی حس اتنی کند ہو چکی تھی کہ بڑی بڑی چیزیں بھی نہ کھٹکتی تھیں اب وہ اتنی تیز ہوگئی ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی کھٹکنے لگی ہیں۔ خدا کے سامنے ذمہ داری وجوابدہی کا عقیدہ اب احساس بنتا جا رہا ہے اور بہت سی زندگیوں میں اس احساس سے نمایاں تبدیلی ہو رہی ہے۔ لوگ اب اس نقطۂ نظر سے سوچنے لگے ہیں کہ دنیا کی زندگی میں جو کچھ سعی و عمل وہ کر رہے ہیں وہ آیا خدا کی میزان میں کسی قدر و وزن کی حامل ہو سکتی ہے یا محض ھَبَآءً مَّنْثُوْرًا بن جانے والی ہے۔ پھر بحمد اللہ اس تحریک نے جہاں بھی نفوذ کیا ہے بے مقصد زندگیوں کو بامقصد بنایا ہے اور صرف ان کے مقصدِ زندگی ہی کو نہیں بلکہ مقصد تک پہنچنے کی راہ کو بھی ان کی نگاہوں کے سامنے بالکل واضح کر دیا ہے۔ خیالات کی پراگندگی دور ہو رہی ہے۔ فضول اور دور از کار دلچسپیوں سے دل خود ہٹ رہے ہیں۔ زندگی کے حقیقی اور اہم تر مسائل مرکز توجہ بن رہے ہیں۔ فکر و نظر ایک منظم صورت اختیار کر رہی ہے اور ایک شاہراہِ مستقیم پر حرکت کرنے لگی ہے۔ غرض بحیثیت مجموعی وہ ابتدائی خصوصیات اچھی خاصی قابلِ اطمینان رفتار کے ساتھ نشو و نما پا رہی ہیں جو اسلام کے بلند ترین نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے اولاً و لازماً مطلوب ہیں۔

اگرچہ تشکیلِ جماعت کے بعد ہی بدگمانی پھیلانے والے عناصر نے باہر سے اور مایوسی و بددلی پھیلانے والے عناصر نے اندر سے اس صحیح ارتقاء کے راستے میں رکاوٹ ڈالنی شروع کر دی تھی اور حال کے جماعتی فتنہ نے تو اس کو صدمۂ عظیم پہنچایا، مگر اب تک کے پورے کام کا جائزہ لینے کے بعد یہ اطمینان ہوا کہ تمام مزاحمتوں کے باوجود یہ ارتقاء اپنی فطری رفتار پر چل رہا ہے، اور یہ مزاحمتیں آخرکار اس کے لیے سببِ ضعف نہیں بلکہ فی الجملہ سببِ قوت ہی ثابت ہوں گی۔

اس میں شک نہیں کہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا اس کے لحاظ سے، جو کچھ ہوا وہ بہت کم ہے۔ لیکن اس کمی کا احساس اگر کسی شخص کو مایوس ہو کر بیٹھ جانے پر آمادہ کرتا ہے تو اس کو متنبہ ہو جانا چاہیے کہ اس قسم کے احساسات ہمیشہ نزغِ شیطانی کا

نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ احساس اس کو تلافی مافات کے لیے سعی و جہد پر ابھارتا ہے تو اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور جو کچھ کمی وہ محسوس کرتا ہے اسے پورا کرنے کے لیے مستعدی کے ساتھ کام کرنا چاہیے جہاں تک یہ کمی ہماری کوتاہیوں کے سبب سے ہے اس پر ہم اللہ سے استغفار کرتے ہیں اور آئندہ زیادہ خدمت کی توفیق مانگتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہماری کوتاہیاں ہی اس کمی کا واحد سبب نہیں ہیں، بلکہ اس کے کچھ اور اسباب بھی ہیں جن پر ہمیں کوئی اقتدار حاصل نہیں۔

سب سے پہلا اور اہم سبب جو ہمارے راستے میں غیر معمولی رکاوٹ پیدا کر رہا ہے، موجودہ جنگ ہے۔ ہمارے جو رفقاء اکثر کام کی سست رفتاری دیکھ کر یاس و قنوط کے شکار ہو جاتے ہیں ان کو یاد نہیں رہتا کہ ہم نے کام کی ابتدا ہی جنگ کے زمانہ میں کی ہے اور آغاز کار سے لے کر اب تک جنگی حالات کی گرفت شدید تر ہی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اول تو ایک نظام تمدن و سیاست جو پوری ہمہ گیری کے ساتھ محیط و مسلط ہو اپنے دائرے میں ویسے ہی کسی مخالف دعوت کے لیے اٹھنے اور پھیلنے کی گنجائش بہت کم چھوڑتا ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ جب وہ ایک بیرونی طاقت سے حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو، اس کے حدود میں رہ کر اس نوعیت کی ایک دعوت شروع کرنا جیسی کہ ہم کر رہے ہیں، اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ نظام غالب اس وقت زمین اور اس کے تمام ذرائع پر شدت کے ساتھ قابض ہے اور اپنے بقا کے لیے تمام وسائل کو اس طرح استعمال کر رہا ہے کہ دوسروں کے لیے معمولی اسباب حیات تک نہیں چھوڑنا چاہتا۔ ان حالات میں اُن تحریکوں کے لیے بھی جینا محال ہو رہا ہے جو سالہا سال سے چل رہی تھیں اور گہری بنیادوں پر قائم ہو چکی تھیں۔ پھر کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ ایک ایسی تحریک جو اس نظام کی بالکل ضد ہے اور جس نے عین ہنگامہ جنگ میں جنم لیا ہے، آسانی کے ساتھ جڑ پکڑ سکے گی اور تیز رفتاری کے ساتھ چل سکے گی۔ اس وقت تیز رفتاری کی کوشش گویا خود دشمن کو دعوت دینا ہے کہ آ اور جڑ پکڑنے سے پہلے اس بیج کو زمین سے اکھاڑ پھینک۔

دوسری بڑی رکاوٹ ہماری راہ میں ذرائع کی کمی ہے۔ تشکیل جماعت کے وقت ہمارے پاس صرف ۷۴ روپے کا سرمایہ

تھا اور دو ہزار روپے کی کتابیں ہمارے بکڈپو میں موجود تھیں۔ اتنے قلیل ذرائع سے ہم نے اس عظیم الشان کام کی ابتدار کی تھی جس کا مقصد پورے نظام زندگی کو بدل ڈالنا تھا جماعت میں جو لوگ داخل ہوئے وہ بیشتر غریب تھے اور اب تک خوش حال عنصر ہمارے اندر ایک فی صدی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے ارکانِ جماعت کی طرف سے اس کام میں کوئی قابلِ ذکر مالی اعانت ہمیں حاصل نہیں ہو سکی۔ عام اہلِ خیر سے مدد لینے میں جن اصولوں کی ہم پابندی کرتے ہیں وہ بھی ایسے نہیں ہیں کہ ہم بڑے پیمانہ پر کوئی مستقل مالی اعانت حاصل کرنے کی توقع کر سکیں۔ صرف ایک مستقل ذریعہ ہمارے پاس جماعت کا بکڈپو ہے جس کے بل بوتے پر ہم اطمینان کے ساتھ کام کر سکتے ہیں، چنانچہ اب تک ہم نے زیادہ تر توجہ اسی ذریعہ کو ترقی دینے پر صرف کی ہے اور دوسرے کام شروع کرنے سے قصداً احتراز کیا ہے تاکہ کوئی قدم آگے بڑھنے کے بعد پیچھے نہ پڑنے پائے۔ اگر جنگی حالات زیادہ شدت نہ اختیار کر گئے ہوتے تو بکڈپو اس وقت اس حد تک ترقی کر چکا ہوتا کہ اس کی مدد سے ہم دوسری تجویزوں پر عمل شروع کر دیتے، لیکن موجودہ حالات نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ اپنے تمام ذرائع اور اپنی ساری توتیں بکڈپو کی زندگی برقرار رکھنے پر صرف کر دیں۔

تیسری اہم رکاوٹ مردانِ کار کی کمی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص تنہا اپنی ذات سے پورا ادارہ نہیں بن سکتا۔ بڑے بڑے اجتماعی کام صرف اسی طرح ہو سکتے ہیں کہ قیادت و رہنمائی کا کام جس شخص کے سپرد ہو اس کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے عمدہ صلاحیتیں رکھنے والے چند آدمی موجود ہوں جو ایک ایک شعبہ کا کام پوری ذمہ داری کے ساتھ سنبھال سکیں۔ اس قسم کے آدمی مجھے ابھی تک میسر نہیں آئے ہیں۔ سات سو آدمیوں کی یہ جماعت، جو گذشتہ ڈیڑھ پونے دو سال کی دعوت و تبلیغ سے فراہم ہوئی ہے، یہ ابھی بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ یہ محض ایک موادِ خام ہے جو آئندہ کی تعمیر کے لیے جمع کیا گیا ہے۔ ابھی اجزارِ مختلفہ کے اس مجموعہ نے کوئی ترکیبی مزاج اختیار نہیں کیا ہے ابھی اس کے اجزار کو جانچنے اور چھانٹنے اور ان کی صلاحیتوں کا جائزہ لینے اور ہر صلاحیت کے جزو کو اس کی مناسب جگہ پر رکھنے کا کام باقی ہے۔ یہ کام زیادہ آسان ہوتا اگر جنگی مشکلات حائل نہ ہوتیں اور بار بار ارکانِ جماعت کے اجتماعات کیے جا سکتے، یا کم از کم چار پانچ

آدمی مجھے ایسے مل گئے ہوتے جن پر مرکز کے کاموں کا بوجھ ڈال کر میں خود پے درپے دورے کر سکتا۔ مگر جو حالات اس وقت درپیش ہیں ان میں نہ تو اجتماعات ہی ہو سکتے ہیں اور نہ میں خود جگہ جگہ پہنچ کر ارکانِ جماعت سے شخصی روابط قائم کر سکتا ہوں۔ اس لیے اب تک میں پوری طرح جماعت کا جائزہ لے کر یہ معلوم نہیں کر سکا ہوں کہ ہمارے رفقا میں کن کن صلاحیتوں کے لوگ موجود ہیں اور ان سے کیا کام لیے جا سکتے ہیں۔ جن رفقا کی صلاحیتوں کا مجھے علم ہو چکا ہے ان سے کام لینے میں بھی متعدد امور مانع ہیں۔ ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو فکرِ معاش سے بے نیاز ہو۔ ان کا پورا وقت اگر جماعت کی خدمت کے لیے حاصل کیا جائے تو ان کی معاش کا انتظام جماعت کو کرنا چاہیے مگر جماعت کے ذرائع اس بار کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کو مرکز میں بلا کر یہ چاہوں کہ اپنی معاش وہ خود پیدا کریں اور جماعت کا کام بھی ساتھ کریں تو یہ بھی ممکن نہیں، کیونکہ موجودہ معاشی نظام اتنا نالائق ہے کہ یہ کسی شخص کو دو وقت کی روٹی نہیں دیتا جب تک کہ اس کا سارا وقت اور اس کی تمام قوتیں سونت نہ لے۔

ان موانع کے سوا ایک اور چیز بھی ہے جس کی وجہ سے اب تک نہ تو کام کی رفتار ہی تیز ہو سکی ہے اور نہ اتنا بہتر کام ہو سکا ہے جیسا ہونا چاہیے تھا۔ وہ یہ ہے کہ ابھی ہمارے ارکان کی تربیت بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ بہت کم ارکان ہیں جنھوں نے اس جماعت کے مزاج اور اس کے مقصد اور طریقِ کار کو اچھی طرح سمجھا ہو اور جو یہ جانتے ہوں کہ انھیں کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔ بیشتر لوگ جو ہمارے حلقہ میں داخل ہوئے ہیں، بہت زیادہ تربیت کے محتاج ہیں۔ ان میں سے متعدد لوگ ایسے ہیں جو محض وقتی اور جزوی کشش کی بنا پر جماعت کے اندر داخل ہو گئے ہیں مگر ان کی ذہنیت، سیرت، اخلاق اور راہِ سعی و عمل میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ بہت سے ایسے ہیں جو "عمل" اور "تنظیم" کے وہی تصورات ابھی تک اپنے ذہن میں لیے ہوئے ہیں جو پہلے کی جماعتوں کو دیکھ کر یا ان کے اندر کام کر کے انھوں نے اخذ کیے تھے۔ وہ بار بار اسی قسم کے "عمل" اور اسی طرز کی "تنظیم" کے مطالبے کرتے ہیں اور ان کے ذہن ابھی تک اس حقیقت کا ادراک نہیں کر سکے ہیں کہ مصنوعی تنظیم اور مظاہرے کے عمل کے سوا تنظیم اور عمل کی کچھ دوسری قوی تر صورتیں بھی ہیں اور اسلامی تحریک کے مزاج

سے وہی زیادہ مناسبت رکھتی ہیں۔ کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اصولی حیثیت سے تو تمام باتیں اچھی طرح سمجھ لی ہیں مگر ابھی تک عملی طریق کار ان کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آیا ہے۔ ان کی حالت اس طالب علم کی سی ہے جس نے صرف کتابوں سے میکانکس کا علم حاصل کیا ہو مگر جب مشین سے اس کو سابقہ پیش آئے تو وہ اس کے سامنے اپنے آپ کو بالکل مبتدی محسوس کرے۔ جماعت کی اکثریت ان مختلف حالتوں میں مبتلا ہے۔ رہے وہ قلیل التعداد ارکان جو خلاصۂ جماعت ہیں تو ان کو بھی ابھی چند ارتقائی مدارج سے گذرنا ہے۔ وہ خوب سمجھ چکے ہیں کہ انھیں کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے، اور حتی الامکان کام بھی کر رہے ہیں، لیکن انھیں اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو، جن کا نشوونما اب تک کسی اور ڈھنگ پر ہوتا رہا ہے اور جن کو کسی اور طریق پر اب تک استعمال کیا جاتا رہا ہے، "اوورہال" کرکے از سر نو مرتب کرنا پڑ رہا ہے اور یہ ترتیب جدید بہر حال ابھی کافی وقت لے گی۔ ان میں جو مقرر تھے اور اچھے مقرر تھے، اس جماعت کے اندر آنے کے بعد یکایک وہ گونگے ہو گئے ہیں کیونکہ ان کی زبان اب تک جس راہ پر چلتی رہی تھی، یہ راہ اس سے بہت مختلف ہے اور اس راہ میں بولنے کے لیے انھیں زبان کو بالکل نئے سرے سے تیار کرنا ہے۔ یہی حال ادیبوں، مصنفوں، معلموں، پبلک کارکنوں اور دوسری قابلیتوں کے رفقاء کا ہے کہ ہر ایک جماعت میں آنے کے بعد اپنی شخصیت کو تبدیل کرنے میں لگا ہوا ہے اور یہ تبدیلی جب تک مکمل نہ ہو لے، یہ لوگ جماعتی عمل میں اپنا پورا حصہ ادا کرنے سے معذور ہیں۔

ان اسباب پر غور کرنے سے کام کی رفتار سست اور غیر محسوس ہونے کے وجوہ اچھی طرح سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ جو عظیم الشان مقصد ہمارے سامنے ہے اور جن زبردست طاقتوں کے مقابلہ میں ہم کو اٹھ کر اس مقصد کے لیے کام کرنا ہے، اس کا اولین تقاضا یہ ہے کہ ہم میں صبر و تدبر اور معاملہ فہمی ہو اور اتنا مضبوط ارادہ موجود ہو جس سے ہم دور رس نتائج کے لیے لگاتار ان تھک سعی کر سکیں۔ بے صبری کے ساتھ جلدی جلدی نتائج برآمد کرنے کے لیے بہت سے ایسے سطحی کام کیے جا سکتے ہیں جن سے ایک وقتی ہیجان برپا ہو جائے، لیکن اس کا کوئی حاصل اس کے سوا نہیں ہے کہ کچھ دنوں تک فضا میں شور رہے اور پھر ایک صدمہ کے ساتھ سارا کام اس طرح برباد ہو کہ مدتہائے دراز تک دوبارہ اس کا نام لینے کی بھی کوئی ہمت نہ کر سکے۔ یہ چیز جن لوگوں کو

مطلوب ہے ان کے لیے مناسب یہ ہے کہ ہمیں پریشان کرنے کے بجائے وہ ہم سے الگ ہوجائیں اور آزادی کے ساتھ جو ہنگامہ برپا کرنا چاہیں کریں۔ مگر جو لوگ اس مقصد کے لیے واقعی کوئی صحیح کام کرنا چاہتے ہیں انھیں شوقِ فضول سے مجتنب ہو کر معمار کے سے صبر کی عادت ڈالنی چاہیے جو تعمیر شروع کرنے سے پہلے سامانِ تعمیر جمع کرتا ہے، پھر دیوار اٹھانے سے پہلے بنیادیں کھودنے اور ان کو مضبوطی کے ساتھ بھرنے میں کافی وقت اور محنت صرف کرتا ہے، پھر ایک ایک اینٹ چُنتا ہے اور جب تک ایک اینٹ کو مستحکم نہیں کر لیتا دوسری اینٹ کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ جس معمار میں اتنا صبر نہیں ہے اور جو بنیاد کھودنے سے پہلے چھت ڈالنا چاہتا ہے اس کے لیے کام کا صحیح میدان زمین نہیں بلکہ ہوا ہے۔

ضروری اعلان

کاغذ کی انتہائی گرانی بلکہ نایابی نے ہمیں اپنی مطبوعات کی قیمتوں میں اضافہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جو کاغذ ہمیں مل رہا ہے وہ قبل جنگ کی قیمتوں سے چھ گنا زیادہ قیمتی ہے۔ اس لیے سابق قیمتوں پر کتابیں فروخت کرنا محال ہے۔ تازہ فہرستِ کتب ترمیم شدہ قیمتوں کے ساتھ چھپ رہی ہے۔

۱۔ رسالہ دینیات۔ غیر مجلد عہ۔ مجلد ۱۲؍ (زیر طبع ہے)
۲۔ خطبات۔ غیر مجلد ۸؍۔ مجلد ۸؍
۳۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول۔ غیر مجلد عہ
۴۔ " " " " حصہ دوم " ۸؍
۵۔ " " " " حصہ سوم " ۸؍
۶۔ مسئلہ قومیت۔ غیر مجلد۔ عہ (زیر طبع)
۷۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش ہر سہ حصص مع مسئلہ قومیت مجلد۔ ۳؍
۸۔ تنقیحات۔ بے جلد ۲؍۔ مجلد ۲؍۸۔ (زیر طبع)
۹۔ تفہیمات۔ بے جلد ۳؍۔ مجلد ۳؍۸۔
۱۰۔ مسئلہ جبر و قدر۔ بے جلد ۱۴؍۔ (زیر طبع)
۱۱۔ تجدید و احیاء دین۔ بے جلد۔ ۱۴؍۔
۱۲۔ پردہ۔ بے جلد ۲؍۔ مجلد ۲؍۸۔
۱۳۔ حقوق الزوجین۔ بے جلد ۱۲؍ (زیر طبع)
۱۴۔ اسلام اور ضبطِ ولادت۔ بے جلد۔ ۱۲؍ (زیر طبع)
۱۵۔ ہیگل، مارکس اور اسلامی نظام۔ بے جلد ۱۲؍۔ (زیر طبع)
۱۶۔ سیرت سید احمد شہید۔ بے جلد ۲؍۔
۱۷۔ سلامتی کا راستہ۔ ۵؍ (زیر طبع)
۱۸۔ اسلام اور جاہلیت۔ ۵؍ (" ")
۱۹۔ شہادتِ حق۔ ۴؍۔
۲۰۔ اسلام کا نظریۂ سیاسی۔ ۵؍ (زیر طبع)
۲۱۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ ۵؍ (زیر طبع)
۲۲۔ انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل۔ ۸؍ (زیر طبع)
۲۳۔ ایک اہم استفتاء۔ ۲؍۔
۲۴۔ نیا نظامِ تعلیم۔ ۵؍ (زیر طبع)
۲۵۔ انگریزی ترجمہ رسالہ دینیات۔ ۱۲؍۔
۲۶۔ " " نظریہ سیاسی۔ ۹؍ (زیر طبع)
۲۷۔ " " اسلامی حکومت ۹؍
۲۸۔ نیشنلزم اینڈ انڈیا۔ ۹؍
۲۹۔ دستور جماعتِ اسلامی ۲؍
۳۰۔ جماعتِ اسلامی کے اجتماعِ اوّل کی روداد۔ ۴؍ (زیر طبع)

نوٹ:۔ محصول ڈاک ان قیمتوں سے علاوہ ہے۔

ملنے کا پتہ

ادارہ "ترجمان القرآن" دارالاسلام جمال پور پٹھان کوٹ

تفہیم القرآن

(۹)

النساء

(از رکوع ۹ تا رکوع ۱۸)

اے نبی تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور اُن کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں، حالانکہ انھیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا[1]۔ شیطان انھیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسول کی طرف تو ان منافقوں کو تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہاری طرف آنے سے کتراتے ہیں[2]۔ پھر اس وقت کیا ہوتا ہے جب ان کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آتی ہے؟ اس وقت یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آتے ہیں[3] اور کہتے ہیں کہ خدا کی

---

[1] یہاں صریح طور پر "طاغوت" سے مراد وہ شخص ہے جو قانونِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور جج ہونے کی حیثیت سے نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔ لہٰذا یہ آیت اس معنی میں بالکل صاف ہے کہ جو حاکم "طاغوت" کی حیثیت رکھتا ہو اس کے پاس اپنے معاملات فیصلہ کے لیے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر، دونوں لازم و ملزوم ہیں، اور خدا اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جھکنا عین منافقت ہے۔

[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین کی عام روش تھی کہ جس معاملہ میں انھیں توقع ہوتی تھی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا اس کا فیصلہ کرانے کے لیے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ جاتے تھے مگر جس معاملہ میں اندیشہ ہوتا تھا کہ فیصلہ ان کے خلاف ہوگا اس کو آپ کے پاس لانے سے انکار کر دیتے تھے۔ یہی حال اب بھی بہت سے منافقوں کا ہے کہ اگر شریعت کا فیصلہ (باقی اگلے صفحہ پر)

قسم ہم تو صرف بھلائی چاہتے تھے اور ہماری نیت تو یہ تھی کہ فریقین میں کسی طرح موافقت ہو جائے ۔۔۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے، ان سے تعرض مت کرو، انھیں سمجھاؤ اور ایسی نصیحت کرو جو ان کے دلوں میں اتر جائے۔ (انھیں بتاؤ کہ) ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے[۹۴]۔ اگر انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمھارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے، اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتا، تو یقیناً یہ اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔ نہیں، تمھارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں[۹۵]، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔ اگر ہم نے انھیں حکم دیا ہوتا کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے کم ہی آدمی اس پر عمل کرتے[۹۶]۔ حالانکہ

(بقیہ سابق) ان کے حق میں ہو تو سر آنکھوں پر، ورنہ ہر اس قانون، اور ہر اس عدالت کے دامن میں جا پناہ لیں گے جس سے انھیں اپنے منشا کے مطابق فیصلہ حاصل ہونے کی توقع ہو۔

[۹۳] غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ جب ان کی اس منافقانہ حرکت کا مسلمانوں کو علم ہو جاتا ہے اور انھیں خوف ہوتا ہے کہ اب بازپرس ہوگی اور سزا ملے گی اُس وقت قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان کا یقین دلانے لگتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۹۴] یعنی خدا کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو، بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے، اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انہی پر عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

[۹۵] خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور اس آیت کا حکم صرف حضور کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لیے ہے۔ جو کچھ اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور جس طریقہ پر اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے تحت آپ نے عمل کیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کن سند ہے اور اس سند کو ماننے یا نہ ماننے ہی پر آدمی کے مومن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔ حدیث میں بھی اس بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ۔ "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اُس طریقہ کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں"۔

[۹۶] یعنی جب ان کا حال یہ ہے کہ شریعت کی پابندی کرنے میں ذرا سا نقصان یا تھوڑی سی تکلیف بھی یہ (باقی اگلے صفحہ پر)

جو نصیحت انھیں کی جاتی ہے اگر یہ اس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتری اور زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا[1] اور جب یہ ایسا کرتے تو ہم انھیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتے اور انھیں سیدھا راستہ دکھا دیتے[2]۔ جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء اور صدیقین[3]، شہداء[4] اور صالحین[5]۔ کیسے اچھے ہیں یہ رفیق جو

(بقیہ سابق) برداشت نہیں کر سکتے تو ان سے کسی بڑی قربانی کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگر جان دینے یا گھر بار چھوڑنے کا مطالبہ ان سے کیا جائے تو یہ فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے اور ایمان و اطاعت کے بجائے کفر و نافرمانی کی راہ لیں گے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی اگر یہ لوگ شک اور تذبذب اور تردد چھوڑ کر یکسوئی کے ساتھ رسول کی اطاعت و پیروی پر قائم ہو جائیں اور ڈانواں ڈول نہ رہیں تو ان کی زندگی تزلزل سے محفوظ ہو جائے گی، ان کے خیالات، اخلاق اور معاملات سب کے سب ایک مستقل اور پائیدار بنیاد پر قائم ہو جائیں گے اور یہ ان برکات سے بہرہ ور ہوں گے جو ایک شاہراہ مستقیم پر ثابت قدمی کے ساتھ چلنے سے حاصل ہوا کرتی ہیں۔ جو شخص تذبذب اور تردد کی حالت میں مبتلا ہو، کبھی اس راستہ پر چلے اور کبھی اس راستہ پر، اور اطمینان کسی راستہ کے بھی صحیح ہونے پر اسے حاصل نہ ہو اس کی ساری زندگی نقش بر آب کی طرح بسر ہوتی ہے اور سعی لاحاصل بن کر رہ جاتی ہے۔

[2] یعنی جب وہ شک چھوڑ کر ایمان و یقین کے ساتھ رسول کی اطاعت کا فیصلہ کر لیں گے تو اللہ کے فضل سے ان کے سامنے سعی و عمل کا سیدھا راستہ بالکل روشن ہو جائے گا اور انھیں صاف نظر آ جائے گا کہ وہ اپنی قوتیں اور محنتیں کس راہ میں صرف کریں جس سے ان کا ہر قدم اپنی حقیقی منزل مقصود کی طرف اٹھے۔

[3] صِدِّیق سے مراد وہ شخص ہے جو نہایت راستباز ہو، جس کے اندر صداقت پسندی اور حق پرستی کمال درجہ پر ہو، جو اپنے معاملات اور برتاؤ میں ہمیشہ سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کرے، جب ساتھ دے تو حق اور انصاف ہی کا ساتھ دے اور سچے دل سے دے، اور جس چیز کو حق کے خلاف پائے اس کے مقابلہ میں ڈٹ کر کھڑا ہو جائے اور ذرا کمزوری نہ دکھائے۔ جس کی سیرت ایسی ستھری اور بے لوث ہو کہ اپنے اور غیر کسی کو بھی اس سے خالص راست روی کے سوا کسی دوسرے طرز عمل کا اندیشہ نہ ہو۔

[4] شہید کے اصل معنی گواہ کے ہیں، اور اس سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے ایمان کی صداقت پر اپنی زندگی کے پورے طرز عمل سے شہادت دے۔ اللہ کی راہ میں لڑ کر جان دینے والے کو بھی شہید اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ جان دے کر ثابت کر دیتا ہے کہ وہ جس چیز پر ایمان لایا تھا اسے واقعی سچے دل سے حق سمجھتا تھا اور اسے اتنا عزیز رکھتا تھا کہ اس کے لیے جان قربان کرنے میں بھی اس نے دریغ نہ کیا۔ ایسے راستباز لوگوں کو بھی شہید کہا جاتا ہے جو اس قدر قابل اعتماد ہوں کہ جس چیز پر وہ شہادت دیں اس کا صحیح و حق ہونا بلا تامل تسلیم کر لیا جائے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کسی کو میسر آئیں۔[۱۰۰] یہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور حقیقت جاننے کے لیے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے۔ ع

اے ایمان لانے والو! مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہو،[۱۰۱] پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔ ہاں، تم میں کوئی کوئی آدمی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے جان چراتا ہے،[۱۰۲] اگر تم پر کوئی مصیبت آئے تو کہتا ہے اللہ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ نہ گیا، اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر فضل ہو تو کہتا ہے ۔۔۔ اور اس طرح کہتا ہے کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا تو کوئی تعلق تھا ہی نہیں ۔۔۔ کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو بڑا کام بن جاتا۔ (ایسے لوگوں کو معلوم ہو کہ) اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے اُن لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں،[۱۰۳] پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا

(بقیہ سابق) [۹۹] صالح سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے خیالات اور عقائد میں، اپنی نیت اور ارادوں میں اور اپنے اقوال و افعال میں راہ راست پر قائم ہو اور فی الجملہ اپنی زندگی میں نیک رویہ رکھتا ہو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۰۰] یعنی وہ انسان خوش قسمت ہے جسے ایسے لوگ دنیا میں رفاقت کے لیے میسر آئیں اور جس کا انجام آخرت میں بھی ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہو۔ کسی آدمی کے احساسات مردہ ہو جائیں تو بات دوسری ہے، ورنہ درحقیقت بدسیرت اور بدکردار لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا دنیا ہی میں ایک عذاب الیم ہے کجا کہ آخرت میں بھی آدمی انہی کے ساتھ اُس انجام سے دوچار ہو جو ان کے لیے مقدر ہے۔ اسی لیے اللہ کے نیک بندوں کی ہمیشہ یہی تمنا رہی ہے کہ ان کو نیک لوگوں کی سوسائٹی نصیب ہو (اَلْحِقْنِی بِالصّٰلِحِیْنَ) اور مر کر بھی وہ نیک ہی لوگوں کے ساتھ رہیں (تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ)۔

[۱۰۱] واضح رہے کہ خطبہ اُس زمانہ میں نازل ہوا تھا جب اُحد کی شکست کی وجہ سے اطراف و نواح کے قبائل کی ہمتیں بڑھ گئی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے تھے۔ آئے دن خبریں آتی رہتی تھیں کہ فلاں قبیلے کے تیور بگڑ رہے ہیں، فلاں قبیلہ دشمنی پر آمادہ ہے، فلاں مقام پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ پے در پے غداریاں کی جا رہی تھیں، ان کے مبلغین کو فریب سے دعوت دی جاتی تھی اور قتل کر دیا جاتا تھا، اور مدینہ کے حدود سے باہر ان کے لیے جان و مال کی سلامتی باقی نہ رہی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کی طرف سے ایک زبردست سعی و جہد اور سخت جاں فشانی کی ضرورت تھی تاکہ ان خطرات کے ہجوم سے اسلام کی یہ تحریک مِٹ نہ جائے۔

[۱۰۲] ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ خود تو جی چراتا ہی ہے، دوسروں کی بھی ہمتیں پست کرتا ہے اور ان کو جہاد سے روکنے کے لیے ایسی باتیں کرتا ہے کہ وہ بھی اسی کی طرح بیٹھ رہیں۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

یا غالب رہے گا اسے ضرور ہم اجرِ عظیم عطا کریں گے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پاکر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے[۱۰۵]۔ جن لوگوں نے ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جنھوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں[۱۰۶]، پس شیطان کے ساتھیوں سے لڑو اور یقین جانو کہ شیطان کی چالیں حقیقت میں نہایت کمزور ہیں[۱۰۷]۔ ع ۱۰

تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انھیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے یا کچھ اس سے بھی بڑھ کر۔ کہتے ہیں خدایا! یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی؟ ان سے کہو،

(بقیہ سابق) ۱۰۴ یعنی اللہ کی راہ میں لڑنا دنیا طلب لوگوں کا کام سرے سے ہی نہیں۔ یہ تو ایسے لوگوں کا کام ہے جن کے پیشِ نظر صرف اللہ کی خوشنودی ہو، جو اللہ اور آخرت پر کامل اعتماد رکھتے ہوں اور دنیا میں اپنی کامیابی و خوشحالی کے سارے امکانات اور اپنے ہر قسم کے دنیوی مفاد اس امید پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کہ ان کا رب ان سے راضی ہوگا اور اس دنیا میں نہیں تو آخرت میں بہرحال ان کی قربانیاں ضائع نہ ہوں گی۔ رہے وہ لوگ جن کی نگاہ میں اصل اہمیت اپنے دنیوی مفاد ہی کی ہو، تو درحقیقت یہ راستہ ان کے لیے نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) ۱۰۵ اشارہ ہے اُن مظلوم بچوں، عورتوں اور مردوں کی طرف جو مکہ میں اور عرب کے دوسرے قبائل میں اسلام قبول کر چکے تھے مگر نہ ہجرت پر قادر تھے اور نہ اپنے آپ کو ظلم سے بچا سکتے تھے۔ یہ غریب طرح طرح سے تختۂ مشقِ ستم بنائے جا رہے تھے اور دعائیں مانگتے تھے کہ کوئی انھیں اس ظلم سے بچائے۔

۱۰۶ یہ اللہ کا دو ٹوک فیصلہ ہے۔ اللہ کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ زمین پر اللہ کا دین قائم ہو، یہ اہلِ ایمان کا کام ہے اور جو واقعی مومن ہے وہ اس کام سے کبھی باز نہ رہے گا۔ اور طاغوت کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ خدا کی زمین پر خدا کے باغیوں کا راج ہو، یہ کافروں کا کام ہے اور کوئی ایمان رکھنے والا آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔

۱۰۷ یعنی بظاہر شیطان اور اس کے ساتھی بڑی تیاریوں سے اُٹھتے ہیں اور بڑی زبردست چالیں چلتے ہیں لیکن اہلِ ایمان کو نہ اُن کی تیاریوں سے خوف زدہ ہونا چاہیے اور نہ ان کی چالوں سے۔ آخر کار ان کا انجام ناکامی ہے۔

۱۰۸ اس آیت کے تین مفہوم ہیں اور تینوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں:

(باقی اگلے صفحہ پر)

دنیا کا سرمایۂ زندگی تھوڑا ہے، اور آخرت ایک خدا ترس انسان کے لیے زیادہ بہتر ہے، اور تم پر ظلم ایک شمہ برابر بھی نہ کیا جائے گا۔ [۵] رہی موت تو جہاں بھی تم ہو وہ بہرحال تمھیں آکر رہے گی خواہ تم کیسی ہی مضبوط عمارتوں میں ہو۔

اگر انھیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ تمھاری بدولت ہے۔ [۶] کہو، سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر اِن لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ (اے انسان) تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کے فضل سے حاصل ہوتی ہے اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسبِ عمل کی بدولت ہے۔ (اے محمد) ہم نے تم کو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے اور اس پر خدا کی گواہی کافی ہے۔ جو رسول کی اطاعت کرے اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی اور جو منہ موڑ جائے تو بہرحال ہم نے تمھیں ان پر پاسبان بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ [۷]

(بقیہ سابق) ایک مفہوم یہ ہے کہ پہلے یہ لوگ خود جنگ کے لیے بے تاب تھے، بار بار کہتے تھے کہ صاحب ہم پر ظلم کیا جا رہا ہے، ہمیں ستایا جاتا ہے، مارا جاتا ہے، گالیاں دی جاتی ہیں، آخر ہم کب تک صبر کریں، ہمیں مقابلہ کی اجازت دی جائے۔ اُس وقت اُن سے کہا جاتا تھا کہ صبر کرو اور نماز و زکوٰۃ سے ابھی اپنے نفس کی اصلاح کرتے رہو، تو یہ صبر و برداشت کا حکم ان پر شاق گذرتا تھا، مگر اب جو قتال کا حکم دیدیا گیا تو انہی تقاضا کرنے والوں میں سے ایک گروہ دشمنوں کا ہجوم اور جنگ کے خطرات دیکھ کر سہما جا رہا ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب تک مطالبہ نماز اور زکوٰۃ اور ایسے ہی بے خطر کاموں کا تھا اور جانیں لڑانے کا کوئی سوال درمیان میں نہ آیا تھا، یہ لوگ پکے دیندار تھے مگر اب جو حق کی خاطر جان جوکھوں کا کام شروع ہوا تو ان پر لرزہ طاری ہونے لگا۔

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ پہلے تو لوٹ کھسوٹ اور نفسانی لڑائیوں کے لیے ان کی تلوار ہر وقت نیام سے نکلی پڑتی تھی اور رات دن کا مشغلہ ہی جنگ و پیکار تھا۔ اُس وقت انھیں خونریزی سے ہاتھ روکنے اور نماز و زکوٰۃ سے نفس کی اصلاح کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اب جو خدا کے لیے تلوار اُٹھانے کا حکم دیا گیا تو وہ لوگ جو نفس کی خاطر لڑنے میں شیر دل تھے خدا کی خاطر لڑنے میں بزدل بنے جاتے ہیں، وہ دستِ شمشیر زن جو نفس اور شیطان کی راہ میں بڑی تیزی دکھاتا تھا، خدا کی راہ میں شل ہوا جاتا ہے۔

یہ تینوں مفہوم مختلف قسم کے لوگوں پر چسپاں ہوتے ہیں اور آیت کے الفاظ ایسے جامع ہیں کہ تینوں پر یکساں دلالت کرتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵] یعنی اگر تم خدا کے دین کی خدمت بجا لاؤ اور اس کی راہ میں جانفشانی دکھاؤ تو یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کے ہاں تمھارا اجر ضائع ہو جائے۔

[۶] یعنی جب فتح و ظفر اور کامیابی و سُرخروئی نصیب ہوتی ہے تو اسے اللہ کا فضل قرار دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اللہ نے ان پر یہ فضل نبی ہی کی بدولت ہوا ہے۔ مگر جب خود اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کے سبب سے کہیں شکست ہوتی ہے اور بڑھتے ہوئے قدم پیچھے پڑنے لگتے ہیں تو سارا الزام

(باقی اگلے صفحہ پر)

وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں، مگر جب تمہارے پاس سے نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو جمع ہو کر تمہاری باتوں کے خلاف مشورے کرتا ہے۔ اللہ ان کی یہ ساری شبانہ سرگوشیاں لکھ رہا ہے، تم ان کی پروا نہ کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو، وہی بھروسہ کے لیے کافی ہے۔ کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔[۱۱۰]

یہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش یا خطرناک خبر سُن پاتے ہیں اُسے لے کر پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر یہ اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم میں آ جائے جو ان کے درمیان اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں۔[۱۱۱] تم لوگوں پر اللہ کی مہربانی اور رحمت نہ ہوتی تو (تمہاری کمزوریاں ایسی تھیں کہ) معدودے

(بقیہ سابق) نبی کے سر تھوپتے ہیں اور خود بری الذمہ ہونا چاہتے ہیں۔

[۱۰۹] یعنی اپنے عمل کے یہ خود ذمہ دار ہیں، ان کے اعمال کی باز پرس تم سے نہ ہوگی۔ تمہارے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ اللہ کے احکام و ہدایات ان تک پہنچا دو۔ یہ کام تم نے بخوبی انجام دے دیا۔ اب یہ تمہارا کام نہیں ہے کہ ہاتھ پکڑ کر انھیں زبردستی راہ راست پر چلاؤ۔ اگر یہ اُس ہدایت کی پیروی نہ کریں جو تمہارے ذریعہ سے پہنچ رہی ہے، تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ لوگ کیوں نافرمانی کرتے تھے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱۱۰] منافق اور ضعیف الایمان لوگوں کی یہ روش بہت بڑی حد تک اس وجہ سے تھی کہ انھیں قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں شک تھا۔ انھیں پورا یقین نہ تھا کہ رسول پر واقعی وحی آتی ہے اور یہ جو کچھ ہدایات آ رہی ہیں، براہ راست خدا کے پاس سے آ رہی ہیں۔ اس لیے فرمایا گیا کہ یہ لوگ قرآن پر غور ہی نہیں کرتے ورنہ یہ کلام تو خود شہادت دے رہا ہے کہ یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کا کلام ہو نہیں سکتا۔ کوئی انسان اس بات پر قادر نہیں ہے کہ سالہا سال تک وہ مختلف حالات میں، مختلف مواقع پر، مختلف مضامین پر تقریریں کرتا رہے اور اول سے آخر تک اس کی ساری تقریریں ایسا ہموار یک رنگ، متناسب مجموعہ بن جائیں جس کا کوئی جز دوسرے جز سے متصادم نہ ہو، جس میں تبدیلی رائے کا کہیں نشان تک نہ ملے، اور جس میں متکلم کے نفس کی مختلف کیفیات اپنے مختلف رنگ نہ دکھائیں۔

[۱۱۱] وہ چونکہ ہنگامہ کا موقع تھا اس لیے ہر طرف افواہیں اڑ رہی تھیں۔ کبھی خطرے کی بے بنیاد یا مبالغہ آمیز اطلاعیں آتیں اور ان سے یکایک مدینہ اور اس کے اطراف میں پریشانی پھیل جاتی۔ کبھی کوئی چالاک دشمن کسی واقعی خطرے کو چھپانے کے لیے اطمینان بخش خبریں بھیج دیتا اور لوگ انھیں سن کر غفلت میں مبتلا ہو جاتے۔ ان افواہوں میں وہ لوگ بڑی دلچسپی لیتے تھے جو محض ہنگامہ پسند تھے، جن کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

چند کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔

پس اے نبی تم اللہ کی راہ میں لڑو، تم اپنی ذات کے سوا کسی اور کے لیے ذمہ دار نہیں ہو، البتہ اہل ایمان کو لڑنے کے لیے اکساؤ، بعید نہیں کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے، اللہ کا زور سب سے زیادہ زبردست اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے۔ جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا[۱]، اور اللہ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے۔

اور جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اس کو اس سے بہتر طریقہ کے ساتھ جواب دو یا کم از کم اسی طرح[۲]، اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی بندگی و عبادت کا مستحق نہیں، وہ تم سب کو قیامت کے روز جمع کریگا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، اور اللہ کی بات سے بڑھ کر سچی بات اور کس کی ہوسکتی ہے[۳]۔ ع

(بقیہ سابق) یہ اسلام اور جاہلیت کے معرکہ کوئی کیدہ معاملہ نہ تھا جنھیں کچھ خبر نہ تھی کہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ افواہیں پھیلانے کے نتائج کس قدر دور رس ہوتے ہیں۔ ان کے کان میں جہاں کوئی بھنک پڑ جاتی اسے لے کر جگہ جگہ پھونکتے پھرتے تھے۔ انھی لوگوں کو اس آیت میں سرزنش کی گئی ہے اور انھیں سختی کے ساتھ تنبیہ فرمایا گیا ہے کہ افواہیں پھیلانے سے باز رہیں اور ہر خبر جو ان کو پہنچے اسے ذمہ دار لوگوں تک پہنچا کر خاموش ہو جائیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی یہ اپنی اپنی پسند اور اپنا اپنا نصیب ہے کہ کوئی خدا کی راہ میں کوشش کرنے اور حق کو سربلند کرنے کے لیے لوگوں کو ابھارے اور اس کا اجر پائے، اور کوئی خدا کے بندوں کو غلط فہمیوں میں ڈالنے اور ان کی ہمتیں پست کرنے اور انھیں اعلائے کلمۃ اللہ کی سعی و جہد سے باز رکھنے میں اپنی قوت صرف کرے، اور اس کی جزا کا مستحق بنے۔

[۲] اُس وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو رہے تھے، اور جیسا کہ تعلقات کی کشیدگی میں ہوا کرتا ہے، اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان دوسرے لوگوں کے ساتھ کج خلقی سے نہ پیش آنے لگیں۔ اس لیے انھیں ہدایت کی گئی کہ جو تمھارے ساتھ احترام کا برتاؤ کرے اس کے ساتھ تم بھی ویسے ہی بلکہ اس سے زیادہ احترام سے پیش آؤ۔ شائستگی کا جواب شائستگی ہی ہے بلکہ تمھارا منصب یہ ہے کہ دوسروں سے بڑھ کر شائستہ ہو۔ ایک داعی و مبلغ گروہ کے لیے، جو دنیا کو راہ راست پر لانے اور مسلک حق کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھا ہو، درشت مزاجی، ترش روئی اور تلخ کلامی مناسب نہیں ہے۔ اس سے نفس کی تسکین تو ہو جاتی ہے مگر اُس مقصد کو اُلٹا نقصان پہنچتا ہے جس کے لیے وہ اٹھا ہے۔

[۳] یعنی کافر و مشرک اور ملحد اور دہریے جو کچھ کر رہے ہیں اس سے خدا کی خدائی کا کچھ نہیں بگڑتا، (باقی اگلے صفحہ پر)

پھر یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمھارے درمیان دو رائیں پائی جاتی ہیں[۱] حالانکہ جو برائیاں انھوں نے کمائی ہیں ان کی بدولت اللہ انھیں الٹا پھیر چکا ہے[۲]۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے ہدایت نہیں بخشی اُسے تم ہدایت بخشدو؟ حالانکہ جس کو اللہ نے راستہ سے ہٹا دیا اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آ جائیں، اور اگر وہ ہجرت سے باز رہیں تو جہاں پاؤ انھیں پکڑو اور قتل کرو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔ البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جا ملیں جس کے ساتھ تمھارا

(بقیہ سابق) وہ خدا ہے۔ یہ حقیقت کسی کے بدلے سے بدل نہیں سکتی۔ ایک روز اللہ ان کو اور تم کو سب کو جمع کرے گا اور ہر ایک نے جو کچھ کیا ہے اس کا نتیجہ دکھا دیگا، اس کی قدرت کے احاطے سے بچ کر کوئی بھاگ نہیں سکتا۔ لہٰذا وہ اس کا ہرگز حاجت مند نہیں ہے کہ اس کی طرف سے کوئی اس کے باغیوں پر جلے دل کا بخار نکالے اور کج خلقی و ترش کلامی کو زخمِ دل کا مرہم بنائے۔

یہ تو اس آیت کا تعلق اوپر کی آیت سے ہے، لیکن یہی آیت اس پورے سلسلۂ کلام کا خاتمہ بھی ہے جو پچھلے دو تین رکوعوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس حیثیت سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں جو شخص اپنے لیے جس راہِ عمل کو پسند کرتا ہے اور جس راہ میں اپنی کوششیں اور محنتیں صرف کرنا چاہتا ہے کیے جائے، آخر کار سب کو اس خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پھر ہر ایک اپنی سعی و عمل کے نتائج دیکھ لے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہاں اُن منافق مسلمانوں کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے جو مکہ میں اور عرب کے دوسرے حصوں میں اسلام قبول کر چکے تھے مگر ہجرت کر کے دارالاسلام کی طرف منتقل ہونے کے بجائے بدستور اپنی کافر قوم ہی کے ساتھ رہتے بستے تھے اور کم و بیش ان تمام کارروائیوں میں عملاً حصہ لیتے تھے جو ان کی قوم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کرتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ سخت پیچیدہ تھا کہ ان کے ساتھ آخر کیا معاملہ کیا جائے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ کچھ بھی ہو، آخر یہ ہیں تو مسلمان ہی۔ کلمہ پڑھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، ان کے ساتھ کفار کا سا معاملہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس رکوع میں اسی اختلاف کا فیصلہ فرمایا ہے۔

[۲] یعنی جس دو رنگی اور مصلحت پرستی اور ترجیحِ دنیا بر آخرت کا اکتساب انھوں نے کیا ہے اس کی بدولت اللہ نے انھیں اُسی طرف پھیر دیا ہے جس طرف سے یہ آئے تھے۔ انھوں نے کفر سے نکل کر اسلام کی طرف پیش قدمی کی تو ضرور تھی، مگر اس سرحد میں آنے اور ٹھیرنے کے لیے یکسو ہو جانے کی ضرورت تھی، اور اس منزل کو قربان کر دینے کی ضرورت تھی جو اسلام و ایمان کے مفاد سے ٹکراتا ہو، اور آخرت پر

(باقی اگلے صفحہ پر)

معاہدہ ہے[۱۱۵]۔ اسی طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمہارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں، نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے۔ اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔ ایک اور قسم کے منافق تمہیں ایسے ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، مگر جب کبھی فتنہ کا موقع پائیں گے اس میں کود پڑیں گے۔ ایسے لوگ اگر تمہارے مقابلہ سے باز نہ رہیں اور صلح و سلامتی تمہارے آگے پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو جہاں یہ ملیں انھیں پکڑو اور مارو، ان پر ہاتھ اُٹھانے کے لیے ہم نے تمہیں کھلی حجت دیدی ہے۔ ع ۱۲

کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے، اِلّا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے[۱۱۶]۔ اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے[۱۱۷] اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا دے[۱۱۸]، اِلّا یہ کہ

(بقیہ سابق) ایسے یقین کی ضرورت تھی جس کی بنا پر آدمی اطمینان کے ساتھ اپنی دنیا کو قربان کر سکتا ہو، یہ ان کو گوارا نہ ہوا۔ اس لیے جدھر سے آئے تھے اُلٹے پاؤں اُدھر ہی واپس چلے گئے۔ اب ان کے معاملہ میں اختلاف کا کون سا موقع باقی ہے؟

(حواشی صفحہ ھذا) ۱۱۵ استثنا اس حکم سے نہیں ہے کہ انھیں دوست اور مددگار نہ بنایا جائے، بلکہ اس حکم سے ہے کہ انھیں پکڑا اور مارا جائے۔ چونکہ خود ایسی کافر قوم سے تعلق رکھتے ہیں، یا ایسی کافر قوم کے حدود میں پناہ لیتے ہیں جس کے ساتھ اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو چکا ہے، اس لیے ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو غیر جانبدار ملک کی رعایا کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

۱۱۶ یہاں اُن منافق مسلمانوں کا ذکر نہیں ہے جن کے قتل کی اوپر اجازت دی گئی ہے، بلکہ اُن مسلمانوں کا ذکر ہے جو یا تو دارالاسلام کے باشندے ہوں، یا اگر دارالحرب یا دارالکفر میں بھی ہوں تو دشمنانِ اسلام کی کارروائیوں میں ان کی شرکت کا کوئی ثبوت نہ ہو۔ چونکہ اس وقت بکثرت لوگ ایسے بھی تھے جو اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی مجبوریوں کی بنا پر دشمنِ اسلام قبیلوں کے درمیان رہتے تھے، اور اکثر ایسے اتفاقات پیش آجاتے تھے کہ مسلمان کسی دشمن قبیلہ پر حملہ کرتے اور وہاں نادانستگی میں کوئی مسلمان اُن کے ہاتھ سے مارا جاتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں اس صورت کا حکم بیان فرمایا ہے جبکہ غلطی سے کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے۔

۱۱۷ چونکہ مقتول مومن تھا اس لیے اس کے قتل کا کفارہ ایک مومن غلام کی آزادی قرار دیا گیا۔

۱۱۸ خوں بہا کی مقدار ملک کے رواج اور قاضی کے اجتہاد سے مقرر ہو گی۔

وہ خوں بہا معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمہاری دشمنی ہو تو اس کا کفارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خوں بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔[۱۲۵] پھر جو غلام نہ پائے وہ پے درپے دو مہینے کے روزے رکھے۔[۱۲۶] یہ اس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے[۱۲۷] اور اللہ علیم و دانا ہے۔ رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

اے ایمان لانے والو جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو اور جو تمہاری طرف سلام سے تقدیم کرے اُسے فوراً نہ کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے۔[۱۲۸] اگر تم دنیوی فائدہ چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمہارے

---

[۱۲۵] اس آیت کے احکام کا خلاصہ یہ ہے:

اگر مقتول دارالاسلام کا باشندہ ہو تو اس کے قاتل کو خوں بہا بھی دینا ہوگا اور خدا سے اپنے قصور کی معافی مانگنے کے لیے ایک غلام بھی آزاد کرنا ہوگا۔

اگر وہ دارالحرب کا باشندہ ہے تو قاتل کو صرف غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اس کا خوں بہا کچھ نہیں ہے۔

اگر وہ کسی ایسے دارالکفر کا باشندہ ہو جس سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہے تو قاتل کو ایک غلام آزاد کرنا ہوگا اور اس کے علاوہ خوں بہا بھی دینا ہوگا، لیکن خوں بہا کی مقدار وہی ہوگی جتنی اس معاہد قوم کے کسی غیر مسلم فرد کو قتل کر دینے کی صورت میں ازروئے معاہدہ دی جانی چاہیے۔

[۱۲۶] یعنی روزے مسلسل رکھے جائیں، بیچ میں ناغہ نہ ہو۔ اگر کوئی شخص عذر شرعی کے بغیر ایک روزہ بھی بیچ میں چھوڑ دے تو اس کو از سر نو روزوں کا سلسلہ شروع کرنا پڑے گا۔

[۱۲۷] یعنی یہ "جرمانہ" نہیں بلکہ "توبہ" اور "کفارہ" ہے۔ جرمانہ میں ندامت و شرمساری اور اصلاحِ نفس کی کوئی روح نہیں ہوتی بلکہ عموماً وہ سخت ناگواری کے ساتھ بمجبوری دیا جاتا ہے اور بیزاری و تلخی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ برعکس اس کے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس بندے سے خطا ہوئی ہے وہ عبادت اور کارِ خیر اور ادائے حقوق کے ذریعہ سے اس کا اثر اپنی روح پر سے دھو دے اور شرمساری و ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے تاکہ نہ صرف یہ گناہ معاف ہو بلکہ آئندہ کے لیے اس کا نفس ایسی غلطیوں کے اعادہ سے بھی محفوظ رہے۔

کفارہ کے لغوی معنی ہیں چھپانے والی چیز۔ کسی کارِ خیر کو گناہ کا "کفارہ" قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نیکی اس گناہ پر چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے جیسے کسی دیوار پر داغ لگ گیا ہو اور اس پر سفیدی پھیر کر داغ کا اثر مٹا دیا جائے۔

[۱۲۸] ابتدائے اسلام میں "السلام علیکم" کا لفظ مسلمانوں کے لیے شعار اور علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک مسلمان دوسرے

(باقی اگلے صفحہ پر)

لیے بہت سے اموال غنیمت ہیں۔ آخر اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا۔ لہٰذا تحقیق سے کام لو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔ اگرچہ ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ

(بقیہ سابق) مسلمان کو دیکھ کر یہ لفظ اس معنی میں استعمال کرتا تھا کہ میں تمہارے ہی گروہ کا آدمی ہوں، دوست اور خیر خواہ ہوں، میرے پاس تمہارے لیے سلامتی و عافیت کے سوا کچھ نہیں ہے، مجھ سے تم عداوت و ضرر کا اندیشہ نہ رکھو۔ جس طرح فوج میں ایک لفظ (Password) کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور رات کے وقت ایک فوج کے آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ فوج مخالف کے آدمیوں سے ممیز ہوں، اسی طرح سلام کا لفظ بھی مسلمانوں میں شعار کے طور پر مقرر کیا گیا تھا اور خصوصیت کے ساتھ اس کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ اس وقت عرب کے نومسلموں اور کافروں کے درمیان لباس، زبان اور کسی دوسری چیز میں کوئی نمایاں امتیاز نہ تھا جس کی وجہ سے ایک مسلمان سرسری نظر میں دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو۔ لیکن لڑائیوں کے موقع پر ایک پیچیدگی یہ پیش آتی تھی کہ مسلمان جب کسی دشمن گروہ پر حملہ کرتے اور وہاں کوئی مسلمان اس لپیٹ میں آجاتا تو وہ حملہ آور مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ بھی ان کا دینی بھائی ہے "السلام علیکم" یا "لا الٰہ الا اللہ" پکارتا تھا، مگر مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی کافر ہے جو محض جان بچانے کے لیے حیلہ کر رہا ہے، اس لیے بسا اوقات وہ اسے قتل کر بیٹھتے تھے اور اس کی چیزیں غنیمت کے طور پر لوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہر موقع پر نہایت سختی کے ساتھ سرزنش فرمائی، مگر اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس پیچیدگی کا حل کیا۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے اس کے متعلق تمہیں سرسری طور پر یہ فیصلہ کر دینے کا حق نہیں ہے کہ وہ محض جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سچا ہو اور ہو سکتا ہے کہ جھوٹا ہو۔ حقیقت تو تحقیق ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ تحقیق کے بغیر چھوڑ دینے میں اگر یہ امکان ہے کہ ایک کافر جھوٹ بول کر جان بچا لے جائے، تو قتل کر دینے میں اس کا امکان بھی ہے کہ ایک مومن بے گناہ تمہارے ہاتھ سے مارا جائے۔ اور بہر حال تمہارا ایک کافر کو چھوڑ دینے میں غلطی کرنا اس سے بدرجہا زیادہ بہتر ہے کہ تم ایک مومن کو قتل کرنے میں غلطی کرو۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) لہ یعنی ایک وقت تم پر بھی ایسا گزر چکا ہے کہ انفرادی طور پر مختلف کافر قبیلوں میں منتشر تھے، اپنے (باقی اگلے صفحہ پر)

بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے؎۔ ان کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ع

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے؎ ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا، کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟؎ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم قرار پایا ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی کمزور ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انھیں معاف کر دے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا؎، اور

(بقیہ سابق) اسلام کو ظلم و ستم کے خوف سے چھپانے پر مجبور رہتے، اور تمھارے پاس ایمان کے زبانی اقرار کے سوا اپنے ایمان کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ اب یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تم کو اجتماعی زندگی عطا کی اور تم اس قابل ہوئے کہ کفار کے مقابلے میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے اٹھے ہو۔ اس احسان کا یہ کوئی صحیح شکریہ نہیں ہے کہ جو مسلمان ابھی پہلی حالت میں مبتلا ہیں ان کے ساتھ تم نرمی و رعایت سے کام نہ لو۔

(حواشی صفحہ ہذا) ؎ یہاں ان بیٹھنے والوں کا ذکر نہیں ہے جن کو جہاد پر جانے کا حکم دیا جائے اور وہ بہانے کرکے بیٹھ رہیں، یا نفیر عام ہو اور جہاد فرض عین ہو جائے پھر بھی وہ جنگ پر جانے سے جی چرائیں۔ بلکہ یہاں ذکر ان بیٹھنے والوں کا ہے جو جہاد کے فرض کفایہ ہونے کی صورت میں میدان جنگ کی طرف جانے کے بجائے دوسرے کاموں میں لگے رہیں۔ پہلی دو صورتوں میں جہاد کے لیے نہ نکلنے والا صرف منافق ہی ہو سکتا ہے اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے کسی بھلائی کا وعدہ نہیں ہے الا یہ کہ وہ کسی حقیقی معذوری کا شکار ہو۔ بخلاف اس کے یہ آخری صورت ایسی ہے جس میں اسلامی جماعت کی پوری فوجی طاقت مطلوب نہیں ہوتی بلکہ محض اس کا ایک حصہ مطلوب ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر امام کی طرف سے اپیل کیا جائے کہ کون سرباز ہیں جو اس مہم کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں، تو جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں وہ افضل ہیں بہ نسبت ان کے جو دوسرے کاموں میں لگے رہیں، خواہ وہ دوسرے کام بھی بجائے خود مفید ہی ہوں۔

؎ مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ابھی تک بلا کسی مجبوری و معذوری کے اپنی کافر قوم ہی کے درمیان مقیم تھے اور نیم مسلمانہ اور نیم کافرانہ زندگی بسر کرنے پر راضی تھے، درآنحالیکہ ایک دار الاسلام مہیا ہو چکا تھا جس کی طرف ہجرت کرکے اپنے دین و اعتقاد کے مطابق پوری اسلامی زندگی بسر کرنا ان کے لیے ممکن ہو گیا تھا یہی ان کا اپنے نفس پر ظلم تھا، کیونکہ ان کو پوری اسلامی زندگی کے مقابلہ میں اس نیم کفر و نیم اسلام پر جس چیز نے قانع و مطمئن کر رکھا تھا وہ محض اپنے نفس کے عیش اور اپنے خاندان، اپنی جائیداد و املاک اور اپنے دنیوی مفاد کی محبت تھی جسے انھوں نے اپنے دین پر ترجیح دی۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے پھر راستہ ہی میں اسے موت آجائے اس کا اجر اللہ کے ذمہ واجب ہو گیا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے۔

جب تم سفر کے لیے نکلو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر نماز میں اختصار کر دو[۱۳۳] (خصوصاً) جبکہ تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر

(بقیہ سابق) [۱۳۱] یعنی جب ایک جگہ خدا کے باغیوں کا غلبہ تھا اور خدا کے قانونِ شرعی پر عمل کرنا ممکن نہ تھا تو وہاں رہنا کیا ضرور تھا؟ کیوں نہ اس سرزمین کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف منتقل ہو گئے جہاں قانونِ الٰہی کی پیروی ممکن ہوتی؟

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو اُس کے لیے نظامِ کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین میں غالب کرنے اور نظامِ کفر کو نظامِ اسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا رہے جس طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت و بیزاری کے ساتھ وہاں مجبورانہ قیام رکھتا ہو۔ ان دو صورتوں کے سوا ہر صورت میں دار الکفر کا قیام ایک مستقل معصیت ہے، اور اس معصیت کے لیے یہ عذر کوئی عذر نہیں ہے کہ ہم دنیا میں کوئی ایسا دار الاسلام پاتے ہی نہیں ہیں جہاں خدا کا قانون جاری ہو۔ اگر کوئی دار الاسلام موجود نہیں ہے تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا کوئی جنگل بھی ایسا نہیں ہے جہاں آدمی درختوں کے پتے کھا کر اور بکریوں کا دودھ پی کر گزر کر سکتا ہو اور احکامِ کفر کی اطاعت سے بچا رہے؟

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوئی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ لا ھجرۃ بعد الفتح، یعنی فتح مکہ کے بعد اب ہجرت نہیں ہے۔ حالانکہ درحقیقت یہ حدیث کوئی دائمی حکم نہیں ہے بلکہ صرف اُس وقت کے حالات میں اہلِ عرب سے ایسا فرمایا گیا تھا جب تک عرب کا بیشتر حصہ دار الکفر و دار الحرب تھا اور صرف مدینہ و اطرافِ مدینہ میں اسلامی احکام جاری ہو رہے تھے، مسلمانوں کے لیے تاکیدی حکم تھا کہ ہر طرف سے سمٹ کر دار الاسلام میں آ جائیں۔ مگر جب فتح مکہ کے بعد عرب میں کفر کا زور ٹوٹ گیا اور قریب قریب پورا ملک اسلام کے زیرِ نگیں آ گیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہجرت کی حاجت باقی نہیں رہی ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے تمام حالات میں قیامت تک کے لیے ہجرت کی فرضیت منسوخ ہو گئی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱۳۳] سفر میں قصر یہ ہے کہ جن اوقات کی نمازیں چار رکعتیں فرض ہیں ان میں دو رکعتیں پڑھی جائیں۔ (در حالتِ جنگ میں قصر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جنگی حالات جس طرح بھی اجازت دیں، نماز پڑھی جائے۔ جماعت کا موقع ہو تو جماعت سے پڑھو ورنہ فرداً فرداً ہی سہی۔ قبلہ رُخ نہ ہو سکتے ہو تو جدھر بھی رُخ ہو۔ سواری پر بیٹھے ہوئے اور چلتے ہوئے بھی پڑھ سکتے ہو۔ رکوع و سجدہ ممکن نہ ہو تو اشارہ ہی سے سہی۔ ضرورت پڑے تو نماز ہی کی حالت میں چل بھی سکتے ہو۔ کپڑوں کو خون لگا ہوا ہو تب بھی مضائقہ نہیں۔ ان سب آسانیوں کے باوجود اگر ایسی

(باقی اگلے صفحہ پر)

(باقی حاشیہ صفحہ سابق) پُر خطر حالت ہو کہ کسی طرح نماز نہ پڑھی جا سکے تو مجبوراً موخر کی جائے جیسے جنگ خندق کے موقع پر ہوا۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ سفر میں صرف فرض پڑھے جائیں یا سنتیں بھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ کہ آپ سفر میں فجر کی سنتوں اور عشا کے وتر کا تو التزام فرماتے تھے مگر باقی اوقات میں صرف فرض پڑھتے تھے۔ سنتیں پڑھنے کا التزام آپ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ نفل نمازوں کا جب موقع ملتا تھا پڑھ لیا کرتے تھے، حتیٰ کہ سواری پر بیٹھے ہوئے بھی پڑھتے رہتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ ابن عمر نے لوگوں کو سفر میں فجر کے سوا دوسرے اوقات کی سنتیں پڑھنے سے منع کیا ہے۔ مگر اکثر علما ترک اور فعل دونوں کو جائز قرار دیتے ہیں اور اسے بندے کے اختیار پر چھوڑ دیتے ہیں۔ حنفیہ کا مختار مذہب یہ ہے کہ مسافر جب حالت سفر میں ہو تو سنتیں نہ پڑھنا افضل ہے اور جب منزل کرے اور اطمینان حاصل ہو تو پڑھنا افضل ہے۔

جس سفر میں قصر کیا جا سکتا ہے اس کے لیے بعض ائمہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ فی سبیل اللہ ہونا چاہیے، جیسے جہاد، حج، عمرہ، طلب علم وغیرہ۔ ابن عمر، ابن مسعود اور عطا کا یہی فتویٰ ہے۔ امام شافعی اور امام احمد کہتے ہیں کہ سفر کسی ایسے مقصد کے لیے ہونا چاہیے جو شرعاً جائز ہو، حرام و ناجائز اغراض کے لیے جو سفر کیا جائے اس میں قصر کی اجازت سے فائدہ اُٹھانے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ قصر ہر سفر میں کیا جا سکتا ہے، رہی سفر کی نوعیت، تو وہ بجائے خود ثواب یا عقاب کی مستحق ہو سکتی ہے، مگر قصر کی اجازت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بعض ائمہ نے "مضائقہ نہیں" (فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ) کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ سفر میں قصر کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ محض اس کی اجازت ہے، آدمی چاہے تو اس سے فائدہ اُٹھائے ورنہ پوری نماز پڑھے۔ یہی رائے امام شافعی نے اختیار کی ہے، اگرچہ وہ قصر کرنے کو افضل اور ترک قصر کو ترک اَولیٰ قرار دیتے ہیں۔ امام احمد کے نزدیک قصر کرنا واجب تو نہیں ہے مگر نہ کرنا مکروہ ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قصر کرنا واجب ہے اور یہی رائے ایک روایت میں امام مالک سے بھی منقول ہے۔ حدیث سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سفر میں قصر کیا ہے اور کسی معتبر روایت میں یہ منقول نہیں ہے کہ آپ نے کبھی سفر میں چار رکعتیں پڑھی ہوں۔ ابن عمر فرماتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ سفروں میں رہا ہوں اور کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے قصر نہ کیا ہو۔ اسی کی تائید میں ابن عباس اور دوسرے متعدد صحابہ سے بھی مستند روایات منقول ہیں۔ حضرت عثمان نے جب حج کے موقع پر منیٰ میں چار رکعتیں پڑھائیں تو صحابہ نے اس پر اعتراض کیا اور حضرت عثمان نے یہ جواب دے کر لوگوں کو مطمئن کیا کہ میں نے مکہ میں شادی کر لی ہے اور چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سُنا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں متاہل ہوا ہو وہ گویا اس شہر کا باشندہ ہے، اس لیے میں نے یہاں قصر نہیں کیا۔ ان کثیر روایات کے خلاف دو روایتیں حضرت عائشہ سے مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قصر اور اتمام دونوں درست ہیں، لیکن یہ روایتیں سنداً ضعیف ہیں۔ نیز یہ خود حضرت عائشہ ہی کے ثابت شدہ مسلک کے خلاف ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ایک حالت بین السفر والحضر بھی ہوتی ہے جس میں ایک ہی عارضی فرودگاہ پر کبھی قصر اور کبھی اتمام دونوں کیے جا سکتے ہیں، اور غالباً حضرت عائشہ نے اسی حالت کے متعلق فرمایا ہے کہ نبی صلی اللہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

تمھیں ستائیں گے کیونکہ وہ کھلم کھلا تمھاری دشمنی پر تلے ہوئے ہیں۔ اور اے نبی! جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور (حالتِ جنگ میں) انھیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور اسلحہ لیے

(بقیہ سابق) علیہ وسلم نے سفر میں قصر بھی کیا ہے اور اتمام بھی) رہے قرآن کے یہ الفاظ کہ "مضائقہ نہیں اگر قصر کرو" تو ان کی نظیر سورہ بقرہ رکوع ۱۹ میں گزر چکی ہے جہاں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کے متعلق بھی یہی الفاظ فرمائے گئے ہیں، حالانکہ یہ سعی مناسک حج میں سے ہے اور واجب ہے۔ دراصل دونوں جگہ یہ کہنے کا مقصود اس اندیشہ کو دور کرنا ہے کہ ایسا کرنے سے کہیں کوئی گناہ تو لازم نہیں آئے گا یا ثواب میں کمی تو نہ ہوگی۔

مقدارِ سفر جس میں قصر کیا جا سکتا ہے، ظاہریہ کے نزدیک کچھ نہیں ہے، ہر سفر میں قصر کیا جا سکتا ہے خواہ کم ہو یا زیادہ۔ امام مالک کے نزدیک ۴۸ میل یا ایک دن رات سے کم کے سفر میں قصر نہیں ہے۔ یہی رائے امام احمد کی ہے۔ ابن عباس کا بھی یہی مسلک ہے اور امام شافعی سے بھی ایک قول اس کی تائید میں مروی ہے۔ حضرت انس ۱۵ میل کے سفر میں قصر کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ امام اوزاعی اور امام زہری حضرت عمر کی اس رائے کو لیتے ہیں کہ ایک دن کا سفر قصر کے لیے کافی ہے۔ حسن بصری دو دن، اور امام ابو یوسف دو دن سے زیادہ کی مسافت میں قصر جائز سمجھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک جس سفر میں پیدل یا اونٹ کی سواری سے تین دن صرف ہوں (یعنی تقریباً ۱۸ فرسنگ یا ۵۴ میل)، اس میں قصر کیا جا سکتا ہے۔ یہی رائے ابن عمر، ابن مسعود اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی ہے۔

اثنائے سفر میں دوران قیام جس میں قصر کیا جا سکتا ہے مختلف ائمہ کے نزدیک مختلف ہے۔ امام مالک اور شافعی کے نزدیک جہاں چار دن یا اس سے زیادہ قیام کا ارادہ ہو وہاں قصر جائز نہیں۔ امام اوزاعی ۱۳ دن اور امام ابو حنیفہ ۱۵ دن یا اس سے زیادہ کی نیت قیام پر پوری نماز ادا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کوئی صریح حکم مروی نہیں ہے۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۱] ظاہریوں اور خارجیوں نے اس فقرے کا یہ مطلب لیا ہے کہ قصر صرف حالتِ جنگ کے لیے ہے اور حالتِ امن کے سفر میں قصر کرنا قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن حدیث میں مستند روایت سے ثابت ہے کہ حضرت عمر نے جب یہی شبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو حضور نے فرمایا صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته (یہ قصر کی اجازت ایک انعام ہے جو اللہ نے تمھیں بخشا ہے، لہٰذا اس کے انعام کو قبول کرو)۔ یہ بات قریب قریب تواتر سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امن اور خوف دونوں حالتوں کے سفر میں قصر فرمایا ہے۔ ابن عباس تصریح کرتے ہیں کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم خرج من المدينة الى مكة لا يخاف الا رب العلمين فصلى ركعتين (نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے مکہ تشریف لے گئے اور اس وقت رب العالمین کے سوا کسی کا خوف نہ تھا، مگر آپ نے دو ہی رکعتیں پڑھیں)۔ اسی بنا پر میں نے ترجمہ میں "خصوصاً" کا لفظ قوسین میں بڑھا دیا ہے۔

[۲] امام ابو یوسف اور حسن بن زیاد نے ان الفاظ سے یہ گمان کیا ہے کہ صلوٰۃ خوف صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے (باقی اگلے صفحہ پر)

رہے، پھر جب وہ سجدہ کرلے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے آکر تمہارے ساتھ پڑھے اور وہ بھی مسلح رہے[۱]، کیونکہ کفار اس تاک میں ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ البتہ اگر تم بارش کی وجہ سے تکلیف محسوس کرو یا بیمار ہو تو اسلحہ رکھ دینے میں مضائقہ نہیں، مگر پھر بھی چوکنے رہو

(بقیہ سابق) زمانہ کے لیے مخصوص تھی، حالانکہ قرآن میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ایک حکم دیا گیا ہے اور وہی حکم آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کے لیے ہے۔ اس لیے صلوٰۃ خوف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ پھر بکثرت جلیل القدر صحابہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے حضور کے بعد بھی صلوٰۃ خوف کو جائز رکھا ہے، اور اس باب میں کسی صحابی کا اختلاف مروی نہیں ہے۔

[۲] صلوٰۃ خوف کا یہ حکم اس صورت کے لیے ہے جب کہ دشمن کے حملہ کا خطرہ تو ہو مگر عملاً معرکۂ قتال گرم نہ ہو۔ رہی یہ صورت کہ عملاً جنگ ہو رہی ہو تو اس صورت میں حنفیہ کے نزدیک نماز موخر کر دی جائے گی۔ امام مالک اور امام ثوری کے نزدیک اگر رکوع و سجود ممکن نہ ہو تو اشاروں سے پڑھ لی جائے۔ امام شافعی کے نزدیک نماز ہی کی حالت میں تھوڑی زد و خورد کی جا سکتی ہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے کہ آپ نے غزوہ خندق کے موقع پر چار نمازیں نہیں پڑھیں اور پھر موقع پا کر علی الترتیب انھیں ادا کیا، حالانکہ غزوہ خندق سے پہلے صلوٰۃ خوف کا حکم آچکا تھا۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] صلوٰۃ خوف کی ترکیب کا انحصار بڑی حد تک حالتِ جنگ پر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف جنگی حالات میں مختلف طریقوں سے نماز پڑھائی ہے اور امام وقت مجاز ہے کہ ان طریقوں میں سے جس طریقہ کی اجازت جنگی حالت دے اسی کو اختیار کرے۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ ایک حصہ امام کے ساتھ نماز پڑھے اور دوسرا حصہ دشمن کے مقابلہ پر رہے۔ پھر جب ایک رکعت پوری ہو جائے تو پہلا حصہ سلام پھیر کر چلا جائے اور دوسرا حصہ آکر دوسری رکعت امام کے ساتھ پوری کرے۔ اس طرح امام کی دو رکعتیں ہوں گی اور فوج کی ایک ایک رکعت۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر چلا جائے، پھر دوسرا حصہ آکر ایک رکعت امام کے پیچھے پڑھے، پھر دونوں حصے باری باری سے آکر اپنی چھوٹی ہوئی ایک ایک رکعت بطور خود ادا کر لیں۔ اس طرح دونوں حصوں کی ایک ایک رکعت امام کے پیچھے ادا ہوگی، اور ایک رکعت انفرادی طور پر۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے فوج کا ایک حصہ دو رکعتیں ادا کرے، اور تشہد کے بعد سلام پھیر کر چلا جائے، پھر دوسرا حصہ تیسری رکعت

(باقی اگلے صفحہ پر)

یقین رکھو کہ اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے[۱] پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو۔ اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو۔ نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندی وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔

اِس گروہ[۲] کے تعاقب میں کمزوری نہ دکھاؤ، اگر تم تکلیف اُٹھا رہے ہو تو تمھاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں،

ع حالانکہ تم اللہ سے جس چیز کے امیدوار ہو وہ اس کے امیدوار نہیں ہیں[۳]۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔

اے نبی[۴]! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو حق اللہ نے تمھیں دکھایا ہے اس کے مطابق

(بقیہ سابق) میں آکر شریک ہو اور امام کے ساتھ سلام پھیرے۔ اس طرح امام کی چار اور فوج کی دو دو رکعتیں ہوں گی۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور جب امام دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو تو مقتدی بطور خود ایک رکعت مع تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیں۔ پھر دوسرا حصہ آکر اس حال میں امام کے پیچھے کھڑا ہو کہ ابھی امام دوسری ہی رکعت میں ہو اور یہ لوگ بقیہ نماز امام کے ساتھ ادا کرنے کے بعد ایک رکعت خود اٹھ کر پڑھ لیں۔ اس صورت میں امام کو دوسری رکعت میں طویل قیام کرنا ہوگا۔

پہلی صورت کو ابن عباس، جابر بن عبداللہ اور مجاہد نے روایت کیا ہے۔ دوسرے طریقہ کو عبداللہ بن مسعود نے روایت کیا ہے۔ اور حنفیہ اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ تیسرے طریقہ کو حسن بصری نے ابو بکرہ سے روایت کیا ہے۔ اور چوتھے طریقہ کو امام شافعی اور امام مالک نے تھوڑے اختلاف کے ساتھ ترجیح دی ہے اور اس کا ماخذ سہل بن ابی حثمہ کی روایت ہے۔

ان کے علاوہ صلوٰۃ خوف کے اور بھی طریقے ہیں جن کی تفصیل مبسوطات میں مل سکتی ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی یہ احتیاط جس کا حکم تمھیں دیا جا رہا ہے، محض دنیوی تدابیر کے لحاظ سے ہے، ورنہ دراصل فتح و شکست کا مدار تمھاری تدابیر پر نہیں بلکہ اللہ کے فیصلہ پر ہے۔ اس لیے ان احتیاطی تدبیروں پر عمل کرتے ہوئے تمھیں اس امر کا یقین رکھنا چاہیے کہ جو لوگ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں، اللہ انھیں رسوا کرے گا۔

[۲] یعنی گروہ کفار جو اسلام کی دعوت اور نظام اسلامی کے قیام کی راہ میں مانع و مزاحم بن کر کھڑا ہوا ہے۔

[۳] یعنی تعجب کا مقام ہے اگر اہل ایمان حق کی خاطر اتنی تکلیفیں بھی برداشت نہ کریں جتنی کفار باطل کی خاطر برداشت کر رہے ہیں، حالانکہ اُن کے سامنے صرف دنیا اور اس کے ناپائیدار فائدے ہیں اور اس کے برعکس یہ رب السموات والارض کی خوشنودی و تقرب اور اس کے ابدی انعامات کے امیدوار ہیں۔

[۴] اس رکوع اور اس کے بعد والے رکوع میں ایک اہم معاملہ سے بحث کی گئی ہے جو اسی زمانہ میں پیش آیا تھا (باقی اگلے صفحہ پر)

لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنو، اور اللہ سے درگذر کی درخواست کرو، وہ بڑا درگذر فرمانے والا اور رحیم ہے۔ جو لوگ اپنے نفس سے خیانت کرتے ہیں[۱] ان کی حمایت نہ کرو، اللہ کو وہ شخص پسند نہیں ہے جو خیانت کار و معصیت پیشہ ہو۔ یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے، وہ تو اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب یہ راتوں کو چھپ کر اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔ ان کے سارے

(بقیہ سابق) قصہ یہ ہے کہ انصار کے قبیلہ بنی ظفر میں ایک شخص طعمہ یا بشیر بن اُبیرق تھا۔ اس نے ایک انصاری کی زرہ چرالی اور جب اس کا تجسس شروع ہوا تو مال مسروقہ ایک یہودی کے ہاں رکھ دیا۔ زرہ کے مالک نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استغاثہ کیا اور طعمہ پر اپنا شبہ ظاہر کیا، مگر طعمہ اور اس کے بھائی بندوں اور بنی ظفر کے بہت سے لوگوں نے آپس میں اتفاق کر کے اس یہودی پر الزام تھونپ دیا۔ یہودی سے پوچھا گیا تو اس نے اپنی براءت ظاہر کی، لیکن یہ لوگ طعمہ کی حمایت میں زور شور سے وکالت کرتے رہے اور کہا کہ یہ یہودی خبیث جو حق کا انکار اور اللہ کے رسول سے کفر کرنے والا ہے اس کی بات کا کیا اعتبار، بات ہماری تسلیم کی جانی چاہیے کہ ہم مسلمان ہیں۔ قریب تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مقدمہ کی ظاہری روداد سے متاثر ہو کر اس یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے اور مستغیث کو بھی بنی اُبیرق پر الزام عائد کرنے پر تنبیہ فرماتے، اتنے میں وحی آئی اور معاملہ کی ساری حقیقت کھول دی گئی۔

اگرچہ ایک قاضی کی حیثیت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا روداد کے مطابق فیصلہ کر دینا بجائے خود آپ کے لیے کوئی گناہ نہ ہوتا، اور ایسی صورتیں قاضیوں کو پیش آتی رہی ہیں کہ ان کے سامنے غلط روداد پیش کر کے حقیقت کے خلاف فیصلے حاصل کر لیے جاتے ہیں لیکن اُس وقت جبکہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک زبردست کشمکش برپا تھی اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم روداد مقدمہ کے مطابق یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے تو اسلام کے مخالفوں کو آپ کے خلاف اور پوری اسلامی جماعت اور خود دعوتِ اسلام کے خلاف ایک زبردست اخلاقی حربہ مل جاتا اور وہ یہ کہتے پھرتے کہ اجی یہاں حق و انصاف کا کیا سوال ہے، یہاں تو وہی جتھہ بندی کی عصبیت کام کر رہی ہے جس کے خلاف تبلیغ کی جاتی ہے۔ اسی خطرے سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس مقدمہ میں مداخلت فرمائی۔

ان رکوعوں میں ایک طرف اُن مسلمانوں کو سختی کے ساتھ ملامت کی گئی ہے جنھوں نے محض خاندان اور قبیلہ کی عصبیت میں مجرموں کی حمایت کی تھی، اور دوسری طرف یہ سبق دیا گیا ہے کہ انصاف کے معاملہ میں کسی تعصب کا دخل نہ ہونا چاہیے، یہ ہرگز دیانت نہیں ہے کہ اپنے گروہ کا آدمی اگر برسر باطل ہو تو اس کی بے جا حمایت کی جائے اور دوسرے گروہ کا آدمی اگر برسر حق ہو تو اس کے ساتھ بے انصافی کی جائے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] جو شخص دوسرے کے ساتھ خیانت کرتا ہے وہ دراصل سب سے پہلے خود اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرتا ہے، کیونکہ دل اور دماغ کی
(باقی اگلے صفحہ پر)

اعمال پر اللہ محیط ہے۔ ہاں، تم لوگوں نے اِن مجرموں کی طرف سے دنیا کی زندگی میں تو جھگڑا کر لیا مگر قیامت کے روز ان کی طرف سے کون جھگڑا کرے گا؟ آخر وہاں کون اِن کا وکیل ہوگا؟ اگر کوئی شخص بُرا فعل کر گزرے یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے درگزر کی درخواست کرے تو اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا۔ مگر جو بُرائی کما لے تو اس کی یہ کمائی اُسی کے لیے وبال ہوگی، اللہ کو سب باتوں کی خبر ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ پھر جو کوئی خطا یا گناہ کرے اور اس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دے اس نے تو بڑے بہتان اور صریح گناہ کا بار سمیٹ لیا۔ ع

اے نبی اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا تھا، حالانکہ درحقیقت وہ خود اپنے سوا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں کر رہے تھے اور تمہارا کوئی نقصان نہ کر سکتے تھے[1]۔ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے اور تم کو وہ کچھ بتایا ہے جو تمہیں معلوم نہ تھا، اور اس کا فضل تم پر بہت ہے۔

لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی، ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات، یا کسی نیکی کے کام، یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لیے کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لیے ایسا کرے گا اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔ مگر جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو اور اہلِ ایمان کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے درآں حالیکہ اس پر راہِ راست واضح ہو چکی ہو[2]، تو اُس کو ہم اُسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو

(بقیہ سابق) جو قوتیں اس کے پاس بطور امانت ہیں ان پر بے جا تصرف کر کے وہ انھیں مجبور کرتا ہے کہ خیانت میں اس کا ساتھ دیں اور اپنے ضمیر کو جسے اللہ نے اس کے اخلاق کا محافظ بنایا تھا، اس حد تک دبا دیتا ہے کہ وہ اس خیانت کاری میں سدِ راہ بننے کے قابل نہیں رہتا۔ جب انسان اپنے اندر اس ظالمانہ دست برد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیتا ہے تب کہیں باہر اس سے خیانت و معصیت کے افعال صادر ہوتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یعنی اگر وہ غلط روداد پیش کر کے تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے اور اپنے حق میں انصاف کے خلاف فیصلہ حاصل کر لیتے تو نقصان انہی کا تھا، تمہارا کچھ بھی نہ بگڑتا، کیونکہ خدا کے نزدیک مجرم وہ ہوتے نہ کہ تم۔ جو شخص حاکم کو دھوکا دے کر اپنے حق میں غلط فیصلہ حاصل کرتا ہے وہ دراصل خود اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے کہ ان تدبیروں سے حق اس کے ساتھ ہو گیا حالانکہ فی الواقع اللہ کے نزدیک حق جس کا ہے اُسی کا رہتا ہے اور فریب خوردہ حاکم کے فیصلہ سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

[2] جب مذکورۂ بالا مقدمہ میں وحی الٰہی کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس خائن مسلمان کے خلاف (باقی اگلے صفحہ پر)

ع۱۷

بدترین جائے قرار ہے۔

اللہ کے ہاں[۱۴۶] بس شرک ہی کی بخشش نہیں ہے اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرایا وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔ وہ اللہ کو چھوڑ کر دیویوں کو معبود بناتے ہیں، اُس باغی شیطان کو معبود بناتے ہیں[۱۴۷] جس کو اللہ نے لعنت زدہ کیا ہے، جس نے اللہ سے کہا تھا کہ میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا[۱۴۸]، میں انھیں بہکاؤں گا، میں انھیں آرزوؤں میں اُلجھاؤں گا، میں اُنھیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے جانوروں کے کان پھاڑیں گے[۱۴۹] اور میں انھیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے خدائی ساخت میں ردّ و بدل کریں گے[۱۵۰]۔

(بقیہ سابق) اور اس بے گناہ یہودی کے حق میں فیصلہ صادر فرما دیا تو اس پر جاہلیت کا اس قدر سخت دورہ پڑا کہ وہ مدینہ سے نکل کر اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے پاس مکہ چلا گیا اور کھلم کھلا مخالفت پر آمادہ ہو گیا۔ اس آیت میں اس کی اسی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۴۶ اس رکوع میں اوپر کے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ اپنی جاہلیت کے طیش میں آ کر یہ شخص جس راہ کی طرف گیا ہے وہ کیسی راہ ہے، اور صالحین کے گروہ سے الگ ہو کر جن لوگوں کا ساتھ اس نے اختیار کیا ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔

۱۴۷ شیطان کو اس معنی میں تو کوئی بھی معبود نہیں بناتا کہ اس کے آگے مراسمِ پرستش ادا کرتا ہو اور اس کو الوہیت کا درجہ دیتا ہو البتہ اُسے معبود بنانے کی صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی باگیں شیطان کے ہاتھ میں دیدیتا ہے۔ اور جدھر جدھر وہ چلاتا ہے ادھر چلتا ہے، گویا کہ یہ اُس کا بندہ ہے اور وہ اِس کا خدا۔

۱۴۸ یعنی اُن کے اوقات میں، اُن کی محنتوں اور کوششوں میں، ان کی قوتوں اور قابلیتوں میں، ان کے مال اور ان کی اولاد میں اپنا حصہ لگاؤں گا اور ان کو فریب دے کر ایسا پرچاؤں گا کہ وہ ان ساری چیزوں کا ایک معتدبہ حصہ میری راہ میں صرف کریں گے۔

۱۴۹ اہلِ عرب کے توہمات میں سے ایک کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے ہاں قاعدہ تھا کہ جب اونٹنی پانچ یا دس بچے جن لیتی تو اس کے کان پھاڑ کر اسے اپنے دیوتا کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس سے کام لینا حرام سمجھتے تھے۔ اسی طرح جس اونٹ کے نطفہ سے دس بچے ہو جاتے اُسے بھی دیوتا کے نام پر پُن کر دیا جاتا تھا اور کان چیرنا اس بات کی علامت تھا کہ یہ پُن کیا ہوا جانور ہے۔

۱۵۰ یعنی فطرت کے خلاف چلیں گے۔ خدا کی بنائی ہوئی ساخت میں ترمیم کرنے کی کوشش کریں گے، جن قوتوں اور جن چیزوں کو اللہ نے جس غرض کے لیے بنایا ہے اس کے خلاف انھیں استعمال کریں گے یا اپنی خواہشات کے مطابق ردّ و بدل کرنے لگیں گے جیسے ضبطِ تولید، مرد و عورت کو بانجھ بنانا، مردوں کو خواجہ سرا بنانا، عورتوں کو تمدن کے تمام شعبوں میں مردوں کے دوش بدوش لا کھڑا کرنا، رہبانیت۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

اس شیطان کو جس نے اللہ کے بجائے اپنا ولی و سرپرست بنا لیا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔ وہ ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انھیں امیدیں دلاتا ہے۔[۱] مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں ہیں۔ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے جس سے خلاصی کی کوئی صورت یہ نہ پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں، تو انھیں ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنی بات میں سچا ہوگا۔

انجام کار نہ تمھاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلہ میں اپنے لیے کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا۔ اور جو نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔ اُس شخص سے بہتر اور کس کا طریقہ ہو سکتا ہے جو اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور نیک رویہ رکھے اور یکسو ہو کر ابراہیم کی روش پر چلے کہ اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔[۲] آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے[۳] اور اللہ ہر چیز پر محیط ہے۔[۴] ۱۸

(بقیہ سابق) اور برہم چریہ اور ایسے ہی دوسرے سب نِشما افعال جو سب کے سب اس بات کا ثبوت ہیں کہ انسان خالق کائنات کے ٹھیرائے ہوئے قوانینِ فطرت کو غلط سمجھتا ہے اور انھیں خود درست کرنے کی جرأت کر رہا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] شیطان کا سارا کاروبار ہی وعدوں اور امیدوں کے بل پر چلتا ہے۔ وہ انسان کو انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر جس غلط راستے کی طرف بھی لے جاتا ہے اُس کے آگے ایک سبز باغ پیش کر دیتا ہے۔ کسی کو انفرادی کامیابیوں کی اُمید، کسی کو قومی سربلندیوں کی توقع، کسی کو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا یقین، کسی کو صداقت تک پہنچ جانے کا اطمینان، کسی کو یہ بھروسہ کہ نہ خدا ہے نہ آخرت بس مر کر مٹی ہو جانا ہے، کسی کو یہ تسلی کہ آخرت ہے بھی تو وہاں کی گرفت سے فلاں کے طفیل اور فلاں کے صدقے میں بچ نکلوں گا۔ غرض جس کو جس وعدے اور جس توقع سے فریب کھا سکتا ہے اس کے سامنے وہی پیش کرتا ہے اور پھانس لیتا ہے۔

[۲] یعنی اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا اور خود سری و خود مختاری سے باز آجانا۔ اس لیے بہترین طریقہ ہے کہ یہ حقیقت کے عین مطابق ہے۔

[۳] جب اللہ زمین و آسمان کا اور ان ساری چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں تو انسان کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ اس کی بندگی و اطاعت پر راضی ہو جائے اور سرکشی چھوڑ دے۔

[۴] یعنی اگر انسان اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرے اور سرکشی سے باز نہ آئے تو وہ اللہ کی گرفت سے بچ کر کہیں بھاگ نہیں سکتا، اللہ کی قدرت اس کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

مقالات

دین حق

(ایک خطبہ جو ۲۱ مارچ ۱۹۴۳ء کو جامعہ ملیہ، دہلی میں دیا گیا)

قرآن جس دعوے کے ساتھ نوعِ انسانی کو اپنے پیش کردہ مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے وہ خود اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

یہی ذرا سا فقرہ میری اس تقریر کا موضوع ہے۔ زیادہ تفصیل کا موقع نہیں۔ بہت اختصار کے ساتھ میں پہلے اس کے معنی کی تشریح کروں گا جس سے واضح ہو جائے گا کہ اس فقرہ میں دراصل کس چیز کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ پھر اس سوال پر بحث کروں گا کہ یہ دعویٰ تسلیم کیا جانا چاہیے یا نہیں، اور آخر میں یہ بیان کروں گا کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس کو تسلیم کر لینے کے مقتضیات کیا ہیں۔

عموماً اس فقرہ کا جو سیدھا سادھا مفہوم بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ "سچا مذہب تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے۔" اور "اسلام" کا جو تصور عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ایک مذہب کا نام ہے جو آج سے ۱۳ سو برس پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا اور جس کی بنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی تھی ــــ "بنا ڈالی تھی" کا لفظ میں قصداً اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ بکثرت مسلمان اور اچھے خاصے ذی علم مسلمان بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "بانی اسلام" کہتے اور لکھتے ہیں، گویا ان کے نزدیک اسلام کی ابتدا آنحضرت ہی سے ہوئی ہے اور آپ ہی اس کے بانی یا (Founder) ہیں ــــ لہٰذا جب ایک غیر مسلم قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اس فقرے پر پہنچتا ہے تو وہ یہ گمان کر کے سرسری طور پر اس سے گذر جاتا ہے کہ جس طرح ہر مذہب صرف اپنے ہی برحق ہونے اور دوسرے مذہبوں کے باطل ہونے کا مدعی ہے اسی طرح قرآن نے بھی اپنے پیش کردہ مذہب کے برحق ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے، اور جب ایک مسلمان اسے

پڑھتا ہے تو وہ اس وجہ سے اس پر غور کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس مذہب کو اس فقرے میں برحق کہا گیا ہے اُسے وہ خود بھی برحق مانتا ہے، یا اگر غور و فکر کے لیے اس کے ذہن میں کوئی تحریک پیدا ہوتی بھی ہے تو وہ بالعموم یہ رُخ اختیار کر لیتی ہے کہ عیسائیت، ہندومت، بودھ مذہب اور ایسے ہی دوسرے مذاہب سے اسلام کا مقابلہ کر کے اس کی حقانیت ثابت کی جائے۔ لیکن درحقیقت قرآن میں یہ مقام ایسا ہے جس پر ایک سنجیدہ طالبِ علم کو ٹھیر کر بہت غور کرنا چاہیے، اس سے زیادہ غور کرنا چاہیے جتنا اب تک اس پر کیا گیا ہے۔

قرآن کے اس دعوے کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں اَلدِّین اور اَلاسلام کا مفہوم متعین کر لینا چاہیے۔

عربی زبان میں لفظ دین کئی معنوں میں آتا ہے۔ اس کے ایک معنی غلبہ و اقتدار کے ہیں۔ دوسرے معنی اطاعت و غلامی کے۔ تیسرے معنی جزا اور بدلہ کے۔ چوتھے معنی طریقہ اور مسلک کے۔ یہاں یہ لفظ اسی چوتھے معنی میں آیا ہے، یعنی دین سے مراد وہ طریقِ زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے جس کی پیروی کی جائے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ قرآن محض دین نہیں کہہ رہا ہے بلکہ الدّین کہہ رہا ہے۔ اس سے معنی میں وہی فرق واقع ہوجاتا ہے جو انگریزی زبان میں This is a way کہنے کے بجائے (This is the way) کہنے سے واقع ہوتا ہے۔ یعنی قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام ایک طریقِ زندگی ہے، بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام ہی ایک حقیقی اور صحیح طریقِ زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے۔ پھر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن اس لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وسیع ترین معنی میں استعمال کرتا ہے۔ طریقِ زندگی سے اس کی مراد زندگی کے کسی خاص پہلو یا کسی خاص شعبہ کا طریق نہیں بلکہ پوری زندگی کا طریق ہے۔ الگ الگ ایک ایک شخص کی انفرادی زندگی ہی کا طریق نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی سوسائٹی کا طریق بھی ہے۔ ایک خاص ملک یا ایک خاص قوم یا ایک خاص زمانہ کی زندگی کا طریق نہیں بلکہ تمام زمانوں میں تمام انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا طریق ہے۔ لہٰذا قرآن کے دعوے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک پوجا پاٹ اور عالمِ بالا کے اعتقادات اور حیات بعد الموت کے تصور کا ایک صحیح مجموعہ وہی ہے جس کا نام اسلام ہے، نہ اس کا مفہوم

یہ ہے کہ افرادِ انسانی کے مذہبی طرزِ خیال و عمل (جیسا کہ لفظ"مذہبی" کا مفہوم آج کل کی مغربی اصطلاح میں لیا جاتا ہے) کی ایک صحیح صورت وہی ہے جسے اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے، نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عرب کے لوگوں، یا فلاں صدی تک کے انسانوں، یا فلاں دور مثلاً صنعتی انقلاب سے پہلے تک کے آدمیوں کے لیے ایک صحیح نظامِ زندگی وہی ہے جس کو اسلام سے موسوم کیا گیا ہے، بلکہ صریح طور پر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر دور میں پوری نوعِ انسانی کے لیے زمین پر زندگی بسر کرنے کا ایک ہی ڈھنگ اللہ کے نزدیک صحیح ہے، اور وہ ڈھنگ وہی ہے جس کا نام الاسلام ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا کہ ایشیا، اور یورپ کے درمیان کسی مقام پر قرآن کی کوئی نئی تفسیر کی گئی ہے جس کی رو سے "دین" کا مفہوم صرف بندے اور خدا کے انفرادی تعلق تک محدود ہے اور تمدن و سیاست کے نظام سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہ تفسیر اگر خود قرآن سے اخذ کی گئی ہے تو یقیناً بڑی دلچسپ چیز ہوگی، لیکن میں نے اٹھارہ سال تک قرآن کا جو تحقیقی مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں بلاخوفِ تردید کہتا ہوں کہ قرآن اپنے تمام جدید مفسرین کی خواہشات کے علی الرغم "الدین" کے لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ اس سے تمام زمانوں کے تمام انسانوں کے لیے ان کی پوری زندگی کا نظامِ فکر و عمل مراد لیتا ہے۔

اب لفظ "اسلام" کو لیجیے۔ عربی زبان میں اس کے معنی ہیں سپر ڈال دینا، جھک جانا، اطاعت قبول کر لینا، اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ مگر قرآن محض "اسلام" نہیں بولتا بلکہ الاسلام بولتا ہے جو اس کی خاص اصطلاح ہے۔ اس مخصوص اصطلاحی لفظ سے اس کی مراد خدا کے آگے جھک جانا، اس کی اطاعت قبول کر لینا اس کے مقابلہ میں اپنی آزادی سے دست بردار ہو جانا، اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا ہے۔ اس تسلیم و اطاعت اور سپردگی و حوالگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانونِ طبیعت Law of nature کے آگے سپر ڈال دی جائے، جیسا کہ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے تخیل یا اپنے مشاہدات و تجربات سے خدا کی مرضی اور اس کے منشاء کا جو تصور بطورِ خود اخذ

کرلے اسی کی اطاعت کرنے لگے، جیسا کہ کچھ اور لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے خود اپنے رسولوں کے ذریعہ سے انسان کے لیے جس طریق فکر و عمل کی طرف رہنمائی کی ہے اس کو وہ قبول کرلے اور اپنی آزادیٔ فکر و عمل ـــ یا بالفاظ صحیح تر، آوارگیٔ فکر و عمل ـــ چھوڑ کر اس کی پیروی و اطاعت اختیار کرلے۔ اسی چیز کو قرآن "الاسلام" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہ درحقیقت کوئی جدید العہد مذہب نہیں ہے جس کی بنا اب سے ۱۳۴۳ برس پہلے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی ہو بلکہ جس روز پہلی مرتبہ اس کرۂ زمین پر انسان کا ظہور ہوا اسی روز خدا نے انسان کو بتا دیا تھا کہ تیرے لیے صرف یہ "الاسلام" ہی ایک صحیح طرز عمل ہے، اور اس کے بعد دنیا کے مختلف گوشوں میں وقتاً فوقتاً جو پیغمبر بھی خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے مامور ہوئے ہیں ان سب کی دعوت بھی بلا استثناء اسی "الاسلام" کی طرف رہی ہے جس کی طرف بالآخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دعوت دی۔ یہ اور بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے بعد میں بہت سی مختلف چیزوں کی آمیزش کرکے ایک نظام یہودیت کے نام سے، اور مسیح علیہ السلام کے پیروؤں نے ایک دوسرا نظام مسیحیت کے نام سے، اور اسی طرح ہندوستان، ایران، چین اور دوسرے ممالک کے پیغمبروں کی امتوں نے مختلف مخلوط و مرکب نظامات دوسرے ناموں سے بنا لیے ہوں، لیکن موسیٰ اور مسیح اور دوسرے تمام معروف و غیر معروف انبیاء علیہم السلام جس دین کی دعوت دینے آئے تھے وہ خالص اسلام تھا نہ کہ کچھ اور۔

اس تشریح کے بعد قرآن کا دعویٰ بالکل صاف اور واضح صورت میں ہمارے سامنے آجاتا ہے، اور وہ یہ ہے:

> "نوعِ انسانی کے لیے خدا کے نزدیک صرف یہی ایک صحیح طریق زندگی ہے کہ وہ خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کردے اور فکر و عمل کی اس راہ پر چلے جس کی طرف خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے رہنمائی کی ہے۔"

یہ ہے قرآن کا دعویٰ۔ اب ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ آیا یہ دعویٰ قبول کیا جانا چاہیے؟ خود قرآن نے اپنے اس دعوے کی تائید میں جو دلائل قائم کیے ہیں ان پر تو ہم غور کریں گے ہی۔ مگر کیوں نہ اس سے پہلے خود اپنی

جگہ تلاش و تجسس کر کے یہ دریافت کرلیں کہ آیا ہمارے لیے اس دعوے کو قبول کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیے بہرحال ایک طریقِ زندگی درکار ہے جسے وہ اختیار کرے۔ انسان دریا نہیں ہے جس کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے خود معین ہو جاتا ہے۔ انسان درخت نہیں ہے جس کے لیے قوانینِ فطرت ایک راہ طے کر دیتے ہیں۔ انسان نِرا جانور نہیں ہے جس کی رہنمائی کے لیے تنہا جبلّت ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اپنی زندگی کے ایک بڑے حصّے میں قوانینِ طبیعت کا محکوم ہونے کے باوجود انسان زندگی کے بہت سے ایسے پہلو رکھتا ہے جن میں اسے کوئی لگا بندھا راستہ نہیں ملتا کہ حیوانات کی طرح بے اختیار اس پر چلتا رہے، بلکہ اس کو اپنے انتخاب سے خود ایک راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس کو فکر کی ایک راہ چاہیے جس پر وہ اپنے اور کائنات کے ان بہت سے مسائل کو حل کرے جنھیں فطرت اس کے سوچنے والے دماغ کے سامنے پیش کرتی ہے مگر ان کا کوئی حل ، غیر مشتبہ زبان میں نہیں بتاتی۔ اس کو علم کی ایک راہ چاہیے جس پر وہ ان معلومات کو منظم کرے جنھیں فطرت اس کے حواس کے ذریعہ سے اس کے ذہن تک پہنچاتی ہے مگر انہیں بطور خود منظم کر کے اس کے حوالے نہیں کر دیتی۔ اس کو شخصی برتاؤ کے لیے ایک راہ چاہیے جس پر وہ اپنی ذات کے بہت سے ان مطالبات کو پورا کرے جن کے لیے فطرت تقاضا تو کرتی ہے مگر انہیں پورا کرنے کا کوئی مہذب طریقہ معین کر کے نہیں دیتی - اس کو گھریلو زندگی کے لیے، خاندانی تعلقات کے لیے، معاشی معاملات کے لیے، ملکی انتظام کے لیے، بین الاقوامی ربط و تعلق کے لیے اور زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں کے لیے بھی ایک راہ درکار ہے جس پر وہ محض ایک شخص کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک جماعت، ایک قوم، ایک نوع کی حیثیت سے بھی چلے اور ان مقاصد تک پہنچ سکے جو اگرچہ فطرۃً اس کے مطلوب و مقصود ہیں مگر فطرت نے نہ تو ان مقاصد کو صریح طور پر اس کے سامنے نمایاں کیا ہے اور نہ ان تک پہنچنے کا ایک راستہ معین کر دیا ہے۔ زندگی کے یہ مختلف پہلو جن میں کوئی ایک طریق اختیار کرنا انسان کے لیے ناگزیر ہے، بجائے خود مستقل

اور ایک دوسرے سے بے نیاز شعبے یا محکمے نہیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے لیے آدمی الگ الگ راہیں اختیار کر سکتا ہو جن کی سمتیں الگ الگ ہوں جن کے زادِ راہ الگ ہوں، جن پر چلنے کے ڈھنگ اور انداز الگ ہوں، جن کی راہ نوردی کے مقتضیات الگ ہوں، اور جن کی منازلِ مقصود الگ ہوں۔ انسان اور اس کی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی ایک ذرا سی دانشمندانہ کوشش ہی آدمی کو اس امر پر مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے کہ زندگی بحیثیت مجموعی ایک کُل ہے جس کا ہر جز، دوسرے جز سے اور ہر پہلو دوسرے پہلو سے گہرا ربط رکھتا ہے، ایسا ربط رکھتا ہے جو توڑا نہیں جا سکتا، ہر ایک دوسرے پر اثر ڈالتا ہے اور اس سے اثر قبول کرتا ہے، ایک ہی خون سب کی رگوں میں گردش کرتا ہے، ایک ہی روح سب میں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے اور سب مل کر وہ چیز بناتے ہیں جسے انسانی زندگی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا فی الواقع جو چیز انسان کو درکار ہے وہ زندگی کے مقاصد نہیں بلکہ مقصد ہے جس کے ضمن میں سارے چھوٹے بڑے مقاصد پوری موافقت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ لے سکیں اور جس کے حصول کی کوشش میں وہ سب حاصل ہو جائیں۔ اس کو راستے نہیں بلکہ راستہ درکار ہے جس پر وہ اپنی پوری زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں سمیت کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنے مقصودِ حیات کی طرف لے چلے۔ اس کو فکر، علم، ادب، آرٹ، تعلیم، مذہب، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون وغیرہ کے لیے الگ الگ نظامات نہیں بلکہ ایک جامع نظام درکار ہے جس میں یہ سب ہمواری کے ساتھ سموئے جا سکیں، جس میں ان سب کے لیے ایک ہی مزاج اور ایک ہی طبیعت رکھنے والے مناسب اصول موجود ہوں، اور جس کی پیروی کر کے آدمی اور آدمیوں کا ہر مجموعہ، اور من حیث الکل پوری آدمیت اپنے بلند ترین مقصود تک پہنچ سکے۔ وہ جاہلیت کا تاریک دور تھا جب زندگی کو مستقل جداگانہ شعبوں میں تقسیم کرنا ممکن خیال کیا جاتا تھا۔ اب اگر کچھ لوگ اس طرز خیال کی مہمل گفتگو کرنے والے موجود ہیں تو وہ بیچارے یا تو اخلاص کے ساتھ پرانے خیالات کی فضا میں اب تک سانس لے رہے ہیں اس لیے قابلِ رحم ہیں، یا پھر وہ ظالم حقیقت کو خوب جانتے ہیں مگر جان بوجھ کر یہ گفتگو صرف اس لیے کرتے ہیں کہ جس "دین" کو وہ کسی انسانی آبادی میں رائج کرنا چاہتے ہیں اس کے اصولوں سے

اختلاف رکھنے والوں کو انھیں یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے اس دین کے تحت تمھیں زندگی کے فلاں فلاں شعبوں میں، جو بدقسمتی سے تم کو عزیز تر ہیں، پورا تحفظ حاصل رہے گا، حالانکہ یہ تحفظ عقلاً محال، فطرۃً ممتنع، عملاً ناممکن ہے اور اس طرح کی گفتگو کرنے والے غالباً خود بھی جانتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔ ہر دینِ غالب زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی رُوح اور اپنے مزاج کے مطابق ڈھال کر ہی رہتا ہے جس طرح ہر کانِ نمک ان تمام چیزوں کو مبدل بنمک کر کے ہی رہتی ہے جو اس کے حدود میں داخل ہو جائیں۔

پھر جس طرح یہ بات مہمل ہے کہ انسانی زندگی کو جداگانہ شعبوں میں تقسیم کیا جائے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مہمل بات یہ ہے کہ اِسے جغرافی حلقوں یا نسلی دائروں میں تقسیم کیا جائے۔ انسان بلاشبہ زمین کے بہت سے حصوں میں پایا جاتا ہے جن کو دریاؤں نے، پہاڑوں نے، جنگلوں اور سمندروں نے یا مصنوعی سرحدوں نے تقسیم کر رکھا ہے، اور انسان کی بہت سی مختلف نسلیں اور قومیں بھی ضرور پائی جاتی ہیں جن کے درمیان تاریخی، نفسیاتی، اور دوسرے اسباب سے انسانیت کے نشو و ارتقا نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں، لیکن اس اختلاف کو حجت قرار دے کر جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہر نسل، ہر قوم اور ہر جغرافی آبادی کے لیے "دین" یعنی نظامِ زندگی الگ ہونا چاہیے وہ سراسر ایک مہمل بات کہتا ہے۔ اس کی محدود نگاہ مظاہر اور عوارض کے اختلافات میں اُلجھ کر رہ گئی، اِس ظاہری کثرت کے اندر جوہرِ انسانیت کی وحدت کو وہ نہیں پاسکا۔ اگر فی الواقع یہ اختلافات اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی بنا پر دین الگ الگ ہونے چاہییں تو میں کہوں گا کہ زیادہ سے زیادہ جو اختلافات ایک ملک اور دوسرے ملک، ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان آپ پاتے ہیں ان سب کو جس قدر مبالغہ کے ساتھ چاہیں قلمبند کر لیں، اور پھر اُن اختلافات کا خالص علمی جائزہ لیں جو عورت اور مرد میں پائے جاتے ہیں، جو ہر انسان اور دوسرے انسان میں پائے جاتے ہیں، جو ایک ہی ماں اور باپ کے دو بچوں میں پائے جاتے ہیں۔ شاید میں مبالغہ نہ کروں گا اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ علمی تحلیل و تجزیہ میں پہلی قسم کے اختلافات سے یہ دوسری قسم کے اختلافات بہر حال شدید تر ہی نکلیں گے۔ پھر کیوں نہ کہہ دیجیے کہ ہر فرد کا

نظام زندگی الگ ہونا چاہیے ؟ مگر جب آپ انفرادی، جنسی، خاندانی کثرتوں کے اندر وحدت کا ایک عنصر اور پائیدار عنصر ایسا پاتے ہیں جس کی بنیاد پر قوم، وطن یا نسل کا تصور قائم ہو سکتا ہے اور اس تصور کی بنا پر ایک قوم یا ایک ملک کی کثیر آبادی کے لیے ایک نظام زندگی ہونا ممکن خیال کیا جاتا ہے تو آخر کس چیز نے آپ کو روک دیا ہے کہ قومی، نسلی، وطنی کثرتوں کے اندر ایک اور بڑی اور بنیادی وحدت کا عنصر آپ نہیں پا سکتے جس پر انسانیت کا تصور قائم ہو اور جس کی بنا پر تمام عالم انسانی کا ایک دین یا نظامِ زندگی ہونا ممکن خیال کیا جائے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تمام جغرافی، نسلی اور قومی اختلافات کے باوجود وہ قوانینِ طبعی یکساں ہیں جن کے تحت انسان دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے، وہ نظامِ جسمانی یکساں ہے جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے، وہ خصوصیات یکساں ہیں جن کی بنا پر انسان دوسری موجودات سے الگ، ایک مستقل نوع قرار پاتا ہے، وہ فطری داعیات اور مطالبات یکساں ہیں جو انسان کے اندر ودیعت کیے گئے ہیں، وہ قوتیں یکساں ہیں جن کے مجموعہ کو ہم نفسِ انسانی کہتے ہیں اور بنیادی طور پر وہ تمام طبیعی، نفسیاتی، تاریخی، تمدنی، معاشی عوامل بھی یکساں ہیں جو انسانی زندگی میں کارفرما ہیں ؟ اگر یہ واقعہ ہے — اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہے — تو جو اصول انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے صحیح ہوں ان کو عالمگیر ہونا چاہیے۔ ان کے قومی یا نسلی یا وطنی ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ قومیں اور نسلیں ان اصولوں کے تحت اپنی خصوصیات کا اظہار اور جزوی طور پر اپنے معاملاتِ زندگی کا بندوبست مختلف طریقوں سے کر سکتی ہیں، اور ان کو ایسا کرنا چاہیے، مگر انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے جس صحیح دین یا نظامِ زندگی کی ضرورت ہے وہ بہرحال ایک ہی ہونا چاہیے۔ عقل یہ باور کرنے سے انکار کرتی ہے کہ جو چیز ایک قوم کے لیے حق ہو وہ دوسری قوم کے لیے باطل ہو جائے اور جو ایک قوم کے لیے باطل ہو وہ دوسری کے لیے حق ہو جائے۔

ان جہلات، اور جدید زمانے عالمانہ جہلات میں سے ایک اور بات، جو حقیقت کے اعتبار سے جہل ترین ہے، مگر حیرت ہے کہ یقینیت کے پورے وثوق کے ساتھ پیش کی جاتی ہے، انسانی زندگی کی زمانی

تقسیم ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ جو نظامِ زندگی ایک دَور میں حق ہوتا ہے وہ دوسرے دور میں باطل ہو جاتا ہے کیونکہ زندگی کے مسائل و معاملات ہر دور میں بدل جاتے ہیں اور نظامِ زندگی کا حق یا باطل ہونا سراسر ان مسائل و معاملات ہی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ یہ بات اُسی انسانی زندگی کے متعلق کہی جاتی ہے جس کے متعلق ساتھ ہی ساتھ ارتقاء کی گفتگو بھی کی جاتی ہے، جس کی تاریخ میں کارفرما قوانین بھی تلاش کیے جاتے ہیں جس کے گزشتہ تجربات سے حال کے لیے سبق اور مستقبل کے لیے احکام بھی مستنبط کیے جاتے ہیں، اور جس کے لیے "انسانی فطرت" نامی ایک چیز بھی ثابت کی جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا آپ کے پاس کوئی ایسا آلۂ پیمائش ہے جس سے آپ نوعِ انسانی کی اس مسلسل تاریخی حرکت کے درمیان دور، یا زمانے، یا عہد کی واقعی حد بندیاں کر سکتے ہوں؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ان حد بندیوں میں سے کسی ایک خط پر انگلی رکھ کر آپ کہہ سکتے ہوں کہ اس خط کے اُس پار جو مسائل زندگی تھے وہ اِس پار آ کر بالکل تبدیل ہو گئے اور جو حالات اُس پار تھے وہ اس پار نہ باقی نہیں رہے؟ اگر فی الواقع انسانی سرگزشت ایسے ہی الگ الگ زمانی ٹکڑوں میں منقسم ہے تب تو یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک ٹکڑا جو گزر چکا ہے وہ بعد والے ٹکڑے کے لیے محض ایک فضول و لایعنی چیز ہو گیا، اس کے گزرتے ہی وہ سب کچھ ضائع ہو گیا جو انسان نے اُس حصۂ دہر میں کیا تھا، اُس زمانہ میں جو تجربات انسان کو ہوئے وہ بعد والے زمانے کے لیے کوئی سبق اپنے اندر نہیں رکھتے کیونکہ وہ حالات اور وہ مسائل ہی فنا ہو گئے جن میں انسان نے بعض طریقوں کا، بعض اصولوں کا، بعض قدروں کے لیے سعی و جہد کا تجربہ کیا تھا۔ پھر یہ ارتقاء کی گفتگو کیوں؟ یہ قوانینِ حیات کی تلاش کس لیے؟ یہ تاریخی استنباط کس بنا پر؟ جب آپ ارتقاء کا نام لیتے ہیں تو لامحالہ یہ اس بات کو متضمن ہے کہ وہاں ضرور کوئی چیز ہے جو تمام تغیرات کا موضوع بنتی ہے اور ان تغیرات کے اندر اپنے آپ کو باقی رکھتے ہوئے پیہم حرکت کرتی ہے۔ جب آپ قوانینِ حیات پر بحث کرتے ہیں تو یہ اس بات کو مستلزم ہے کہ ان ناپائیدار حالات میں، ان رواں دواں مظاہر میں، ان بننے اور بگڑنے والی صورتوں میں کوئی پائیدار اور زندہ حقیقت بھی ہے جو اپنی ایک ذاتی فطرت اور اپنے کچھ مستقل قوانین رکھتی ہے۔ جب

آپ تاریخی استنباط کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ کے اس طول طویل رستے پر جو مسافر مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا آرہا ہے اور منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا چلا جارہا ہے وہ خود اپنی کوئی شخصیت اور اپنا کوئی مستقل مزاج رکھتا ہے جس کے متعلق یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مخصوص حالات میں مخصوص طور پر کام کرتا ہے، ایک وقت میں بعض چیزوں کو قبول کرتا ہے اور دوسرے وقت میں انھیں رد کردیتا ہے اور بعض دوسری چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ زندہ حقیقت، یہ پائیدار موضوع تغیرات، یہ شاہراہ تاریخ کا مستقل مسافر وہی تو ہے جسے آپ غالباً "انسانیت" کہتے ہیں۔ مگر کیا بات ہے کہ جب آپ راستہ کی منزلوں اور ان میں پیش آنے والے حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو شروع کرتے ہیں تو اس گفتگو میں ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ خود مسافر آپ کو یاد نہیں رہتا؟ کیا یہ صحیح ہے کہ منزلیں اور ان کے حالات اور ان کے مسائل بدل جانے سے مسافر اور اس کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی ساخت بالکل نہیں بدلی، اس کے عناصر ترکیبی وہی ہیں جو اب سے ہزاروں برس پہلے تھے۔ اس کا مزاج وہی ہے، اس کی فطرت کے تقاضے وہی ہیں، اس کی صفات وخصوصیات وہی ہیں، اس کے رجحانات ومیلانات وہی ہیں، اس کی قوتیں اور صلاحیتیں وہی ہیں، اس کی کمزوریاں اور ناقابلیتیں وہی ہیں، اس کے فعل وانفعال اور تاثیر وتاثر کے قاعدے وہی ہیں، اس پر کارفرمائی کرنے والی قوتیں وہی ہیں، اور اس کا کائناتی ماحول بھی وہی ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی ابتدائے آفرینش سے آج تک ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ تاریخ کے دوران میں حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل زندگی کے تغیر سے خود انسانیت بھی بدلتی چلی آئی ہے یا وہ بنیادی چیزیں بھی متغیر ہوتی رہی ہیں جو انسانیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو اس دعوے میں کیا وزن ہوسکتا ہے کہ انسان کے لیے جو چیز کل تریاق تھی وہ آج زہر ہے، جو چیز کل حق تھی وہ آج باطل ہے، جو چیز کل قدر رکھتی تھی وہ آج بے قدر ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسانی افراد اور جماعتوں نے تاریخ کے دوران میں نفس انسانیت کو اور اس سے

تعلق رکھنے والی بنیادی چیزوں کو سمجھنے میں غلطی کھا کر اور بعض حقیقتوں کے اعتراف میں مبالغہ اور بعض کے ادراک میں قصور کر کے جو غلط نظامِ زندگی وقتاً فوقتاً اختیار کیے اور جنہیں انسانیت کبریٰ نے تجربہ کے بعد غلط پا کر دوسرے ایسے ہی نظامات کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور کر دیا، ان کی سرگذشت کے مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ انسانیت کے لیے لازماً ہر دور میں ایک الگ نظامِ زندگی درکار ہے جو صرف اسی دور کے حالات و مسائل سے پیدا ہوا اور انہی کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ حالانکہ زیادہ صحت کے ساتھ اس سرگذشت سے اگر کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس قسم کے زمانی و دوری نظاماتِ زندگی، یا بالفاظِ دیگر موسمی حشرات الارض کو بار بار آزمانے اور ہر ایک کی ناکامی کے بعد اس کے دوسرے جانشین کا تجربہ کرنے میں انسانیتِ کبریٰ کا وقت ضائع ہوتا ہے، اس کی راہ ماری جاتی ہے، اس کے نشوو ارتقار اور اپنے کمالِ مطلوب کی طرف اس کے سفر میں سخت رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ وہ درحقیقت محتاج اور سخت محتاج ہے ایسے نظامِ زندگی کی جو خود اس کو اور اس سے تعلق رکھنے والی تمام حقیقتوں کو جان کر عالمگیر، دائمی اور پائیدار اصولوں پر قائم کیا جائے، جسے لے کر وہ حال و مستقبل کے تمام متغیر حالات سے بخیریت گذر سکے، ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کر سکے، زندگی کے راستے پر افتاں و خیزاں نہیں بلکہ رواں اور دواں اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھ سکے۔

یہ ہے اُس "دین" یا طریقِ زندگی یا نظامِ زندگی کی نوعیت جس کا انسان حاجت مند ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اگر انسان خدا کی مدد سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لیے اس نوعیت کا ایک دین بنانا چاہے تو کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ سوال میں آپ کے سامنے پیش نہ کروں گا کہ آیا انسان اب تک ایسا دین خود بنانے میں کامیاب ہوا ہے، کیونکہ اس کا جواب قطعاً نفی میں ہے۔ خود وہ لوگ بھی، جو آج بڑے بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اپنے اپنے دین پیش کر رہے ہیں اور ان کے لیے ایک دوسرے سے لڑ رہے مر رہے ہیں، یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی کا پیش کردہ دین ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے جن کے لیے

انسان من حیث الانسان ایک "الدین" کا محتاج ہے۔ کسی کا دین نسلی و قومی ہے، کسی کا جغرافی، کسی کا طبقاتی اور کسی کا دین پیدا ہی اُس دور کے تقاضوں سے ہوا ہے جو ابھی کل ہی گزر چکا ہے، رہا وہ دور جو کل آنے والا ہے اس کے حالات و مسائل کے متعلق پیشگی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں بھی وہ کام دے سکے گا یا نہیں کیونکہ جو دور اب گزر رہا ہے، ابھی تو اس کے تاریخی تقاضوں کا جائزہ لینا باقی ہے۔ اسی لیے میں سوال یہ نہیں کر رہا ہوں کہ انسان ایسا دین بنانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں، بلکہ یہ کر رہا ہوں کہ کامیاب ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس سے سرسری طور پر بحث کرنا مناسب نہیں۔ یہ انسانی زندگی کے فیصلہ کن سوالات میں سے ایک ہے۔ اس لیے پہلے خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ وہ چیز کیا ہے جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے، اور اس شخص کی قابلیتیں کیا ہیں جس کے متعلق یہ پوچھا جا رہا ہے کہ وہ اس کو وضع کر سکتا ہے یا نہیں۔

انسان کے لیے جس الدین کی ضرورت میں نے ابھی ثابت کی ہے اس سے مراد کوئی ایسا تفصیلی ضابطہ نہیں ہے جس میں ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے لیے تمام چھوٹے بڑے جزئیات تک مرتب ہوں اور جس کی موجودگی میں انسان کا کام صرف اس کے مطابق عمل کرنا ہو۔ بلکہ دراصل اس سے مراد ایسے ہمہ گیر ازلی و ابدی اصول ہیں جو تمام حالات میں انسان کی رہنمائی کر سکیں۔ اس کی فکر و نظر، سعی و جہد اور پیش قدمی کے لیے صحیح رُخ متعین کر سکیں اور اسے غلط تجربات میں وقت اور محنت اور قوت ضائع کرنے سے بچا سکیں۔ اس غرض کے لیے انسان کو سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ اُسے اس بات کا علم — قیاس و گمان نہیں بلکہ علم — ہو کہ اس کی اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ پھر وہ اس بات کے جاننے کا — سمجھ بیٹھنے کا نہیں بلکہ جاننے کا — حاجتمند ہے کہ آیا زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے یا یہ پوری زندگی کا ایک ابتدائی حصہ ہے، آیا سفر بس پیدائش سے لے کر موت تک کی مسافت تک کا ہے یا یہ پورے سفر میں سے محض ایک مرحلہ ہے۔ پھر اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ایک ایسا مقصد زندگی اس کے لیے متعین ہو جو حقیقت کے اعتبار سے — نہ کہ محض خواہش کی بنا پر — واقعی

حیاتِ انسانی کا مقصود ہو، جس کے لیے دراصل انسان پیدا کیا گیا ہو اور جس کے ساتھ ہر فرد، ہر مجموعۂ افراد، اور بحیثیت کلی تمام انسانیت کے مقاصد تمام زمانوں میں بلاکسی تصادم و مزاحمت کے ہم آہنگ ہو سکیں۔ پھر اس کو اخلاق کے ایسے پختہ اور ہمہ گیر اصولوں کی ضرورت ہے جو اس کی فطرت کی تمام خصوصیات کے ساتھ مناسبت بھی رکھتے ہوں اور تمام ممکن حالات پر نظری و عملی حیثیت سے منطبق بھی ہو سکتے ہوں تاکہ وہ انہی اصولوں کی بنیاد پر اپنی سیرت کی تعمیر کر سکے، انہی کی رہنمائی میں سفرِ زندگی کی ہر منزل اور اس کے حالات میں پیش آمدہ مسائل کو حل کر سکے، اور اس خطرے میں مبتلا نہ ہو کہ تغیر پذیر حالات و مسائل کے ساتھ ساتھ اخلاق کے اصول بناتا اور بدلتا چلا جائے، یعنی بالفاظِ دیگر ایک بے اصولا نرا ابن الوقت Characterless opportunist بن کر رہ جائے۔ پھر اس کو تمدن کے ایسے وسیع اور جامع اصولوں کی ضرورت ہے جو انسانی اجتماع کی حقیقی غایت اور اس کے فطری تقاضوں کو سمجھ کر بنائے جائیں، جن میں افراط و تفریط اور بے اعتدالی نہ ہو، جن میں تمام انسانوں کی مجموعی مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہو، اور جن کی پیروی کر کے ہر زمانے میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تشکیل، تعمیر اور ترقی کے لیے سعی کی جا سکے۔ پھر اسے شخصی کردار، اجتماعی رویّہ اور انفرادی و اجتماعی سعی و عمل کو صحیح سمتِ سفر کا پابند اور بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسے جامع حدود کی ضرورت ہے جو شاہ راہِ زندگی پر نشاناتِ راہ کا کام دیں اور ہر موڑ، ہر دوراہے، ہر خطرناک مرحلے پر اسے آگاہ کر دیں کہ تیرا راستہ اُدھر نہیں بلکہ اِدھر ہے۔ پھر اس کو چند ایسے عملی ضابطوں کی ضرورت ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے دائمی اور عالمگیر پیروی کے قابل ہوں اور انسانی زندگی کو اُس حقیقتِ نفس الامری، اُس مآلِ زندگی، اُس مقصدِ حیات، اُن اصولِ اخلاق، اُن اصولِ تمدن اور اُن حدودِ عمل سے ہمیشہ وابستہ رکھیں جن کی تعیین اُس الدین میں کی گئی ہو۔

یہ ہے وہ چیز جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے۔ اب غور کیجیے کیا انسان ایسے ذرائع رکھتا ہے جن سے وہ خود اپنے لیے ایسا ایک الدین وضع کر سکے؟

انسان کے پاس اپنا "دین" یا طریقِ زندگی اخذ کرنے کے ذرائع چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ پہلا ذریعہ خواہش ہے۔ دوسرا ذریعہ عقل ہے۔ تیسرا ذریعہ مشاہدہ و تجربہ ہے۔ چوتھا ذریعہ پچھلے تجربات کا تاریخی ریکارڈ ہے۔ غالباً ان کے سوا

کسی پانچویں ذریعہ کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی۔ ان چاروں ذرائع کا جتنا مکمل جائزہ لے کر آپ دیکھ سکتے ہوں، دیکھیے کہ آیا یہ "الدین" کے ایجاد کرنے میں انسان کی مدد کرسکتے ہیں؟ میں نے اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصہ اس سوال کی تحقیق میں صرف کیا ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ ذرائع "الدین" کی ایجاد میں تو مدد نہیں کرسکتے، البتہ اگر کوئی غیر انسانی رہنما "الدین" کو پیش کردے تو اُسے سمجھنے، پرکھنے، پہچاننے اور اس کے مطابق زندگی کے تفصیلی نظام کو وقتاً فوقتاً مرتب کرتے رہنے میں ضرور مددگار بن سکتے ہیں۔

پہلے خواہش کو لیجیے۔ کیا یہ انسان کی رہنما بن سکتی ہے؟ اگرچہ یہ انسان کے اندر اصلی محرکِ عمل ہے مگر اس کی عین فطرت میں جو کمزوریاں موجود ہیں اُن کی بنا پر یہ رہنمائی کے قابل ہرگز نہیں ہوسکتی۔ تنہا رہنمائی کرنا تو درکنار، عقل اور علم کو بھی اکثر اس نے گمراہ کیا ہے۔ اس کو تربیت سے خواہ کتنا ہی روشن خیال بنا دیا جائے، بہرحال آخری فیصلہ جب کبھی اس پر چھوڑا جائے گا، بہ بلا مبالغہ ۹۹ فی صدی حالات میں غیر مستقیم ہی فیصلہ کرے گی کیونکہ اس کے اندر جو تقاضے پائے جاتے ہیں وہ اِس کو صحیح فیصلہ کرنے کے بجائے ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں جن سے مطلوب کسی نہ کسی طرح جلدی اور بآسانی حاصل ہوجائے۔ یہ نفس "خواہشِ انسانی" کی طبعی کمزوری ہے، لہٰذا خواہ ایک فرد کی خواہش ہو، یا ایک طبقہ کی ہو، یا وہ خواہشِ عام General will ہو جس کا روسو نے ذکر کیا ہے، بہرحال کسی قسم کی انسانی خواہش میں بھی فطرۃً یہ صلاحیت نہیں ہے کہ ایک "الدین" کے وضع کرنے میں مددگار بن سکے۔ بلکہ جہاں تک مسائلِ عالیہ، مثلاً حیاتِ انسانی کی حقیقت، اس کے مآل اور اس کی غایت کا تعلق ہے، ان کو حل کرنے میں تو وہ کسی طرح مددگار بن ہی نہیں سکتی۔

پھر عقل کو لیجیے۔ اِس کی تمام بہترین صلاحیتیں مسلّم، انسانی زندگی میں اس کی اہمیت بھی ناقابلِ انکار، اور یہ بھی تسلیم کہ انسان کے اندر یہ بہت بڑی رہنما طاقت ہے، لیکن قطع نظر اس سوال کے کہ انسان کے لیے الدین کس کی عقل وضع کرے گی، زید کی؟ بکر کی؟ تمام انسانوں کی؟ یا انسانوں کے کسی خاص گروہ کی؟ اِس زمانہ کے لوگوں کی؟ یا کسی پچھلے زمانہ والوں کی؟ یا آئندہ آنے والوں کی؟ سوال صرف یہ ہے کہ نفس "عقلِ انسانی" کے حدود کا جائزہ

لینے کے بعد کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ "الدین" کے وضع کرنے میں اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اس کے تمام فیصلے منحصر ہیں اُس مواد پر جو حواس اِس کو فراہم کر کے دیں۔ وہ غلط مواد فراہم کر کے دیں گے تو یہ غلط فیصلہ کرے گی، وہ ناقص مواد فراہم کر دیں گے تو یہ ناقص فیصلہ کر دے گی۔ اور جن امور میں وہ کوئی مواد فراہم نہ کریں گے ان میں اگر یہ خود شناس ہے تو کوئی فیصلہ نہ کریگی اور اگر بر خود غلط ہے تو اندھیرے میں چوبائی تیر چلاتی رہے گی۔ یہ محدودیتیں جس بیچاری عقل کے ساتھ لگی ہوئی ہیں وہ آخر کس طرح اس کی اہل ہو سکتی ہے کہ نوعِ انسانی کے لیے "الدین" بنانے کی تکلیف اسے دی جائے۔ "الدین" بنانے کا انحصار جن مسائل عالیہ کے حل پر ہے، ان میں حواس سرے سے کوئی مواد فراہم ہی نہیں کرتے۔ پھر کیا ان مسائل کا فیصلہ تخیلات، لاطائل قیاسات اور مجرد اوہام سے کیا جائے گا؟ "الدین" بنانے کے لیے جن مستقل اخلاقی قدروں کا تعین ناگزیر ہے ان کے لیے حواس بہت ہی ناقص مواد فراہم کرتے ہیں۔ پھر کیا عقل سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ناقص مواد پر صحیح و کامل قدریں معین کرے گی؟ اسی طرح "الدین" کے جو دوسرے اجزائے ترکیبی میں نے بیان کیے ہیں ان میں سے کسی ایک جزء کے لیے بھی حواس سے بالکل صحیح اور مکمل مواد حاصل نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر عقل ایک جامع و مکمل نظام بنا سکے۔ اور اس پر مزید یہ ہے کہ عقل کے ساتھ خواہش کا عنصر مستقل طور پر لگا ہوا ہے جو اُسے ٹھیٹھ عقلی فیصلے دینے سے روکتا ہے اور اس کی راست روی کو کچھ نہ کچھ ٹیڑھ کی طرف مائل کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ عقلِ انسانی حواس کے فراہم کردہ مواد کی ترتیب اور اس سے استدلال کرنے میں کوئی غلطی نہ کرے گی تب بھی اپنی کمزوریوں کی بنا پر وہ اتنا بل بوتا نہیں رکھتی کہ اتنے بڑے کام کا بوجھ اس پر ڈالا جا سکے۔ یہ بوجھ اس پر ڈالنا اس پر بھی ظلم ہے اور خود اپنے اوپر بھی۔

اب تیسرے ذریعہ کو لیجیے یعنی وہ علم جو مشاہدات و تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ میں اس علم کی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے میں کسی طالب علم سے پیچھے نہیں ہوں اور نہ ذرہ برابر اس کی تحقیر کرنا پسند کرتا ہوں، لیکن اس کی محدودیتوں کو نظر انداز کر کے اسے وہ وسعت دینا، جو فی الواقع اسے حاصل نہیں ہے، میرے نزدیک بے علمی ہے۔ "علم انسانی" کی حقیقت پر جس شخص کی بھی نظر ہو گی وہ اس بات کو ماننے سے انکار نہ کرے گا کہ جہاں تک مسائل عالیہ کا تعلق ہے، ان کی کنہ تک

اُس کی رسائی محال ہے، کیونکہ انسان کو وہ ذرائع حاصل ہی نہیں ہیں جن سے وہ اس تک پہنچ سکے۔ نہ وہ اس کا براہِ راست مشاہدہ کر سکتا ہے اور نہ مشاہدہ و تجربہ کے تحت آنے والی اشیاء سے استدلال کر کے اس کے متعلق ایسی رائے قائم کر سکتا ہے جس پر علم کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ لہٰذا "الدین" وضع کرنے کے لیے جن مسائل کا حل معلوم کرنا سب سے پہلی ناگزیر ضرورت ہے وہ تو علم کی دسترس سے باہر ہی ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اخلاقی قدریں، تمدن کے اصول، اور بے راہ روی سے بچانے والے حدود معین کرنے کا کام آیا علم کے حوالے کیا جا سکتا ہے یا نہیں، تو اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ کام کس شخص یا کس گروہ یا کس زمانہ کا علم انجام دے گا، ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ علمی طور پر یہ کام انجام دینے کے لیے ناگزیر شرائط کیا ہیں۔ اس کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ اُن تمام قوانینِ فطرت کا علم حاصل ہو جن کے تحت انسان اس دنیا میں جی رہا ہے۔ اس کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ خود انسان کی اپنی زندگی سے جو علوم تعلق رکھتے ہیں وہ مکمل ہوں۔ اس کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے علوم یعنی کائناتی اور انسانیاتی علوم کی معلومات یکجا ہوں اور کوئی ذہن کامل ان کو صحیح ترتیب دے کر، ان سے صحیح استدلال کر کے، انسان کے لیے اخلاقی قدروں، تمدن کے اصولوں، اور بے راہ روی سے بچانے والی حدوں کا تعین کرے۔ یہ شرائط نہ اس وقت پوری ہوئی ہیں، نہ امید کی جا سکتی ہے کہ پانچ ہزار برس بعد پوری ہو جائیں گی۔ ممکن ہے کہ انسانیت کی وفات سے ایک دن پہلے یہ پوری ہو جائیں، مگر اس وقت اِس کا فائدہ ہی کیا ہو گا۔

آخر میں اُس ذریعۂ علم کو لیجیے جسے ہم پچھلے انسانی تجربات کا تاریخی ریکارڈ یا انسانیت کا نامۂ اعمال کہتے ہیں۔ اس کی اہمیت اور اس کے فائدوں سے مجھے انکار نہیں ہے، مگر میں کہتا ہوں، اور غور کریں گے تو آپ بھی مان لیں گے کہ "الدین" وضع کرنے کا عظیم الشان کام انجام دینے کے لیے یہ بھی ناکافی ہے۔ میں یہ سوال نہیں کرتا کہ یہ ریکارڈ ماضی سے حال کے لوگوں تک صحت اور جامعیت کے ساتھ پہنچا بھی ہے یا نہیں؟ میں یہ بھی نہیں پوچھتا کہ اس ریکارڈ کی مدد سے الدین وضع کرنے کے لیے انسانیت کا نمائندہ کس ذہن کو بنایا جائے گا؟ ہیگل کے ذہن کو؟ مارکس کے ذہن کو؟ ارنسٹ ہیکل کے ذہن کو؟ یا کسی اور ذہن کو؟ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ماضی، حال، یا مستقبل میں

کس تاریخ تک کا ریکارڈ ایک "الدین" وضع کرنے کے لیے کافی مواد فراہم کر سکے گا؟ اُس تاریخ کے بعد پیدا ہونے والے خوش قسمت ہیں، باقی رہے اس سے پہلے گذر جانے والے، تو ان کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔

یہ مختصر اشارات جو میں نے کیے ہیں، مجھے توقع ہے کہ میں نے ان میں کوئی علمی یا استدلالی غلطی نہیں کی ہے۔ اور اگر انسان کے ذرائع کا یہ جائزہ جو میں نے لیا ہے صحیح ہے تو پھر ہمیں کوئی چیز اس یقین تک پہنچنے سے باز نہیں رکھ سکتی کہ انسان اپنے لیے کوئی کچا پکا، غلط سلط، وقتی اور مقامی "دین" تو وضع کر سکتا ہے، لیکن وہ چاہے کہ الدین وضع کر سکے، تو یہ قطعی محال ہے، پہلے بھی محال تھا، آج بھی محال ہے، اور آئندہ کے لیے بھی اس کے امکان سے پوری مایوسی ہے۔ اب اگر کوئی خدا رہنمائی کے لیے موجود نہیں ہے، جیسا کہ منکرینِ خدا کا خیال ہے تو انسان کے لیے مناسب یہ ہے کہ خودکشی کرلے۔ جس مسافر کے لیے نہ کوئی رہنما موجود ہو اور نہ جس کے اپنے پاس راستہ معلوم کرنے کے ذرائع موجود ہوں، اس کے لیے یاس اور کامل یاس کے سوا کچھ مقدر نہیں، اس کا کوئی ہمدرد اس کے سوا اسے اور کیا مشورہ دے سکتا ہے کہ سرِ راہ ایک پتھر سے اپنی مشکل آسان کرلے۔ اور اگر خدا ہے لیکن رہنمائی کرنے والا خدا نہیں ہے، جیسا کہ بعض فلسفیانہ اور سائنٹفک طرز کے مثبتینِ خدا کا گمان ہے، تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک صورتِ حال ہے۔ جس خدا نے موجوداتِ عالم کے بقاء و نشوونما کے لیے ہر اس چیز کی فراہمی کا انتظام کیا ہے جس کی ضرورت کا تصور کیا جا سکتا ہو، لیکن ایک نہیں کیا تو صرف انسان کی اُس سب سے بڑی ضرورت کا انتظام جس کے بغیر پوری نوع کی زندگی غلط ہوئی جاتی ہے، اُس کی بنائی ہوئی دُنیا میں رہنا ایک مصیبت ہے، ایسی سخت مصیبت جس سے بڑھ کر کسی دوسری مصیبت کا تصور ممکن نہیں۔ آپ غریبوں اور مفلسوں، بیماروں اور زخمیوں، مظلوموں اور دکھی مبتلاؤں کی مصیبت پر کیا روتے ہیں، روئیے اس پوری نوع کی مصیبت پر جو اس بیچارگی کے عالم میں چھوڑ دی گئی ہے کہ بار بار غلط تجربے کر کے ناکام ہوتی ہے، ٹھوکریں کھا کر گرتی ہے اور پھر اُٹھ کر چلتی ہے تاکہ پھر ٹھوکر کھائے، ہر ٹھوکر پر ملک کے ملک اور قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں، اس غریب کو اپنے مقصدِ زندگی تک کی خبر نہیں ہے، کچھ نہیں جانتی کہ کاہے کے لیے سعی و عمل کرے اور کس ڈھنگ پر کرے۔ یہ سب کچھ وہ خدا دیکھ رہا ہے جو اسے زمین پر وجود میں لایا ہے، مگر وہ بس

پیدا کرنے سے مطلب رکھتا ہے، رہنمائی کی پروا نہیں کرتا۔

اس تصویر کے بالکل برعکس قرآن ہمارے سامنے صورتِ حال کا ایک دوسرا نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا محض پیدا ہی کر دینے والا نہیں ہے بلکہ رہنمائی کرنے والا بھی ہے۔ اس نے موجوداتِ عالم میں سے ہر چیز کو وہ ہدایت بخشی ہے جو اس کی فطرت کے لحاظ سے اس کے لیے ضروری ہے (اَلَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی)۔ اگر اس کا ثبوت چاہو تو جس چیونٹی، جس مکھی، جس مکڑی کو چاہو پکڑ کر دیکھ لو۔ وہی خدا انسان کی بھی رہنمائی کرنے والا ہے، لہٰذا انسان کے لیے صحیح طریقِ کار یہ ہے کہ خود سری چھوڑ کر اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور جس جامع و مکمل نظامِ زندگی یا الدین کی ہدایت اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجی ہے اس کی پیروی اختیار کر لے۔

دیکھیے! ایک طرف وہ نتیجہ ہے جو انسان کی قوتوں اور اس کے ذرائع کا جائزہ لینے سے ہم کو حاصل ہوتا ہے، اور دوسری طرف قرآن کا یہ دعویٰ ہے۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ یا تو اس دعوے کو قبول کریں، یا پھر اپنے آپ کو مایوسی اور اس مایوسی کے حوالے کر دیں جس کے اندھیرے میں کہیں برائے نام بھی اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ دراصل صورتِ حال یہ ہی نہیں کہ الدین حاصل ہونے کے دو وسیلے موجود ہوں اور سوال یہ ہو کہ ہم ان میں سے کس وسیلے سے مدد لیں۔ اصلی صورتِ حال یہ ہے کہ الدین جس وسیلے سے ہم کو مل سکتا ہے وہ صرف ایک ہے اور انتخاب کا سوال صرف اس امر میں ہے کہ آیا ہم اس تنہا وسیلے سے مدد لیں یا اس کی دستگیری کا فائدہ اٹھانے کے بجائے تاریکی میں بھٹکتے پھرنے کو ترجیح دیں۔

یہاں تک جو استدلال میں نے کیا ہے وہ تو ہم کو محض اس حد تک پہنچاتا ہے کہ ہماری فلاح کے لیے قرآن کے اس دعوے کو قبول کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ یعنی بالفاظِ دیگر کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو۔ لیکن قرآن اپنے دعوے کی تائید میں جو دلائل پیش کرتا ہے وہ اس سے بہت زیادہ اعلیٰ اور اشرف ہیں، کیونکہ وہ ہمیں با دلِ ناخواستہ مسلمان ہونے کے بجائے برضا و رغبت مسلمان ہونے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس کی بہت سی دلیلوں میں سے چار سب سے زیادہ پُر زور ہیں اور انہی کو اس نے بار بار تکرار پیش کیا ہے:-

(۱) انسان کے لیے اسلام ہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے اس لیے کہ یہی حقیقتِ نفس الامری کے مطابق ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا رویہ خلافِ حقیقت ہے:

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (آل عمران - ۹)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ حالانکہ وہ سب چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں چار و ناچار اسی کے آگے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں، اور اسی کی طرف انھیں پلٹ کر جانا ہے۔

(۲) انسان کے لیے یہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے کیونکہ یہی حق ہے اور از روئے انصاف اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہو سکتا:

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ (اعراف - ۷)

حقیقت میں تمھارا رب (مالک و فرمانروا) تو اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دوروں میں پیدا کیا اور پھر اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہوا، جو دن کو رات کا لباس اڑھا دیتا ہے اور پھر رات کے تعاقب میں دن تیزی کے ساتھ دوڑا آتا ہے، سورج اور چاند اور تارے سب کے سب جس کے تابع فرمان ہیں، سنو! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا۔ بڑا با برکت ہے وہ کائنات کا رب۔

(۳) انسان کے لیے یہی رویہ صحیح ہے کیونکہ تمام حقیقتوں کا صحیح علم صرف خدا ہی کو ہے اور بے خطا ہدایت صرف وہی کر سکتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ

درحقیقت اللہ سے نہ زمین کی کوئی چیز چھپی ہوئی ہے اور نہ آسمان کی۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ

جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے، اور لوگ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر

بھی حاوی نہیں ہو سکتے بجز اُن چیزوں کے جن کا علم وہ خود ان کو دینا چاہے۔

قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَى	اے پیغمبر کہہ دو کہ اصلی ہدایت صرف خدا ہی کی ہدایت ہے

(۴) انسان کے لیے یہی ایک راہِ راست ہے کیونکہ اس کے بغیر عدل ممکن نہیں، اس کے سوا جس راہ پر بھی انسان چلے گا وہ بالآخر ظلم ہی کی طرف جائے گی:

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ	جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔
وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔	جو اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی ظالم ہیں۔

یہ دلائل ہیں جن کی بنا پر ہر معقول انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور ہدایت کے لیے اُس کی طرف رجوع کرے۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں جو لازماً اس مرحلے پر پہنچ کر ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اپنی تحقیق کے دوران میں خود میرے دل میں بھی پیدا ہو چکا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہر اُس شخص کی بات مان لیں جو ایک دین ہمارے سامنے اس دعوے کے ساتھ پیش کر دے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو آخر ہمارے پاس وہ کیا معیار ہے جس سے ہم انسانی ساخت کے دین اور خدائی ہدایت کے دین میں فرق کر سکیں؟ اس کا جواب اگرچہ بڑی مفصل تحقیقی بحث چاہتا ہے، مگر میں یہاں مختصر اشاروں میں وہ چار بڑے معیار بیان کروں گا جو انسانی فکر اور خدائی فکر کو ممیّز کرتے ہیں:

انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی اور محدودیت کا اثر لازماً پایا جاتا ہے اور اس کے برعکس خدائی فکر میں غیر محدود علم اور صحیح علم کی شان بالکل نمایاں ہوتی ہے۔ جو چیز خدا کی طرف سے ہوگی اس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پا سکتے جو کبھی کسی زمانہ میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو، یا جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس

کے مصنف کی نظر سے حقیقت کا فلاں پہلو اوجھل رہ گیا۔ مگر اس معیارِ تحقیق کو استعمال کرتے ہوئے یہ بات نہ بھول جائیے کہ علم اور علمی قیاس اور نظریۂ علمی میں بڑا فرق ہے۔ ایک وقت میں جو علمی قیاسات اور علمی نظریات دماغوں پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں، اکثر غلطی سے ان کو "علم" سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ ان کے غلط ہونے کا بھی اتنا ہی امکان ہوتا ہے جتنا ان کے صحیح ہونے کا، اور تاریخِ علم میں ایسے بہت کم قیاسات و نظریات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو بالآخر "علم" ثابت ہوئے ہوں۔

انسانی فکر کی دوسری بڑی کمزوری نقطۂ نظر کی تنگی ہے، اور اس کے برخلاف خدائی فکر میں وسیع ترین نقطۂ نظر پایا جاتا ہے۔ جب آپ خدائی فکر سے نکلی ہوئی کسی چیز کو دیکھیں گے تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے اس کا مصنف ازل سے ابد تک دیکھ رہا ہے۔ (پوری کائنات کو دیکھ رہا ہے، تمام حقیقتوں کو بیک نگاہ دیکھ رہا ہے۔) اس کے مقابلہ میں بڑے سے بڑے فلسفی اور مفکر کی فکر بھی ایک بچے کی فکر محسوس ہوگی۔

انسانی فکر کا تیسرا اہم خاصہ یہ ہے کہ اس میں حکمت و دانش، جذبات و خواہشات کے ساتھ کہیں نہ کہیں ساز باز اور مصالحت کرتی نظر آہی جاتی ہے۔ بخلاف اس کے خدائی فکر میں بے لاگ حکمت اور خالص دانشمندی کی شان اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ اس کے احکام میں کہیں آپ جذباتی جھکاؤ کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔

انسانی فکر کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ جو نظامِ زندگی وہ خود تصنیف کرے گا اس میں جانبداری، انسان اور انسان کے درمیان غیر عقلی امتیاز، اور غیر عقلی بنیادوں ہی پر ترجیح بعض علی بعض کا عنصر لازماً پایا جائے گا کیونکہ ہر انسان کی کچھ ذاتی دلچسپیاں ہوتی ہیں جو بعض انسانوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور بعض کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتیں۔ بخلاف اس کے خدائی فکر سے نکلا ہوا نظامِ زندگی ایسے ہر عنصر سے بالکل پاک ہوگا۔

اس معیار پر آپ ہر اس نظامِ زندگی کو جانچ کر دیکھیے جو اپنے آپ کو خدا کی طرف سے "الدین" کہتا ہو۔ اگر وہ انسانی فکر کی ان تمام خصوصیات سے خالی ہو اور پھر جامعیت اور ہمہ گیری کی وہ شان بھی رکھتا ہو جو اس سے پہلے میں نے "الدین" کی ضرورت ثابت کرتے ہوئے بیان کی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس پر ایمان لانے میں تامل کریں۔

(باقی مضمون صفحہ ۶۳ و ۶۴ پر ہے)

خطبہ جمعہ

[یہ خطبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ یوم جمعہ کو مسجد دارالاسلام میں پڑھا گیا]

خطبہ مسنونہ کے بعد :-

آج خدا نے آپ کے لیے دو مبارک دن جمع کر دیے ہیں۔ ایک جمعہ جس کو عیدالمومنین کہا گیا ہے۔ دوسرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم پیدائش۔ اگرچہ شریعت میں حضور کے یوم پیدائش کو عید قرار نہیں دیا گیا ہے، اور نہ اس کے لیے کسی قسم کے مراسم مقرر کیے گئے ہیں لیکن اگر مسلمان یہ سمجھ کر کہ یہ خدا کے سب سے بڑے نبی اور دنیا کے سب سے بڑے ہادی کی پیدائش کا دن ہے، اور یہ وہ دن ہے جس میں انسان کے لیے خدا کی سب سے بڑی نعمت ظہور میں آئی، اس کو عید کی طرح سمجھیں تو کچھ بے جا نہیں ہے۔ البتہ اس عید کے منانے کی یہ صورت نہیں ہے کہ خوب کھاؤ، پیو، چراغاں کرو، جلوس اور جھنڈے نکالو، اور محض اپنی دل لگی کے لیے فضول نمائشی کام کرنے لگو۔ ایسا کرو گے تو تم میں اور جاہل قوموں میں کوئی فرق نہ رہے گا۔ جاہل قومیں بھی اپنی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات کی یاد میلوں ٹھیلوں اور جلوسوں سے مناتی ہیں۔ اگر تم نے بھی ان کے میلوں اور تہواروں کی نقل اتاری تو جیسے وہ ہیں ویسے ہی تم بھی بن کر رہ جاؤ گے۔ اسلام نے تو یادگار منانے کا نیا ہی ڈھنگ نکالا ہے۔ سب سے بڑی یادگار حضرت ابراہیم کی قربانی ہے جسے منانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عیداضحیٰ کی نماز اور قربانی اور حج و طواف کا طریقہ مقرر کیا ہے۔ اس پر تم غور کرو تو اندازہ کر سکتے ہو کہ مسلمان کو اپنی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات کی یاد کس طرح منانی چاہیے۔ تم کو سوچنا چاہیے کہ ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ کس لحاظ سے تمہارے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ اس لحاظ سے نہیں کہ عرب کے ایک شیخ کے گھر میں آج ایک بچہ پیدا ہوا تھا۔ بلکہ اس لحاظ سے کہ آج اس پیغمبر اعظم کو خدا نے زمین پر بھیجا جس کے

ذریعہ سے انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہوئی جس کی بدولت انسان نے حقیقت میں انسان بننا سیکھا جس کی ذات تمام جہان کے لیے خدا کی رحمت تھی، اور جس نے روئے زمین پر ایمان اور عمل صالح کا نور پھیلایا۔

پس جب اس تاریخ کی اہمیت اسی لحاظ سے ہے، تو اس کی یادگار بھی اِس طرح منانی چاہیے کہ آج کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اوروں سے زیادہ پھیلاؤ، آپ کے اخلاق اور آپ کی ہدایات سے سبق حاصل کرو، اور کم از کم آپ کی تعلیم کا اتنا چرچا تو کرو کہ سال بھر تک اس کا اثر باقی رہے۔ اس طرح یادگار مناؤ گے تو حقیقت میں یہ ثابت ہوگا کہ تم یوم میلاد النبی کو سچے دل سے عید سمجھتے ہو۔ اور اگر صرف کھا پی کر، اور دل لگیاں ہی کر کے رہ گئے تو یہ مسلمانوں کی سی عید نہ ہوگی بلکہ جاہلوں کی سی عید ہوگی جس کی کوئی وقعت نہیں۔

آج کے دن کی مناسبت سے میں بھی آج کا خطبہ اسی تقریب کے متعلق دوں گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں فرمایا ہے کہ ہم نے جو نبی بھی بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ اس لحاظ سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے، کیونکہ آپ بھی اللہ کے نبی ہیں۔ لیکن اس عام حکم کے علاوہ اللہ نے جو خاص احکام مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دیے ہیں وہ میں آپ کو سناتا ہوں:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ	اے نبی لوگوں سے کہدو کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تم سے محبت کرے گا۔
اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔	مومنوں کا کام تو یہ ہے کہ جب ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے تاکہ رسول ان کے معاملات میں فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔
مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ	کسی مومن مرد و عورت کا یہ کام نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو وہ پھر خود اپنے اختیار

مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔

سے اس معاملہ میں کوئی حکم لگائیں جس نے اللہ اور رسول
کی نافرمانی کی وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ
فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ
حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

اے نبی قسم ہے تیرے پروردگار کی، وہ اس وقت تک ہرگز مومن
نہ ہوں گے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں کا فیصلہ تجھ پر نہ چھوڑ دیں
اور پھر جو فیصلہ تو کرے اس پر اپنے دل میں بھی وہ برا نہ مانیں
بلکہ سیدھے سیدھے طریقہ سے اس کے آگے سر جھکا دیں۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ
اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ۔

جو لوگ نبی کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کو ڈرنا
چاہیے کہ کہیں وہ فتنہ میں نہ پڑ جائیں۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ
اللّٰهِ۔

تمہارا یہ کام نہیں ہے کہ تم اللہ کے رسول کو اذیت
دو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔

بیشک، جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں
اللہ ان پر دنیا اور آخرت دونوں میں لعنت بھیجے گا۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَاۗءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ
كَدُعَاۗءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔

رسول کی بات کو تم ایسا نہ سمجھ لینا جیسے آپس میں تمہاری
ایک دوسرے کی بات ہوتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ
فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ
بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ
لَا تَشْعُرُوْنَ۔

اے ایمان لانے والو، نبی کی آواز کے مقابلہ میں آواز بلند نہ کرو
اور نہ اس سے اس طرح سختی کے ساتھ بات کرو جس طرح
آپس میں ایک دوسرے سے کرجاتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو
کہ تمہارے سب اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

تم کہیں ایسے لوگ نہ پاؤ گے جو اللہ اور آخرت کے دن پر

اَلْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ

ایمان بھی رکھتے ہوں اور پھر ایسے لوگوں سے دوستی بھی کریں جو اللہ اور رسول کے دشمن ہوں، چاہے وہ ان کے باپ اور بیٹے اور بھائی اور رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

اے نبی، لوگوں سے کہدو کہ اگر تمھیں اپنے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور وہ تجارت جس کے نقصان کا تم کو خوف ہے، اور وہ گھر بار جو تمھیں پسند ہیں، اللہ اور اس کے رسول اور راہ خدا میں جہاد کی بہ نسبت زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو اس وقت کا جب اللہ اپنا فیصلہ سنائے گا۔

اس مضمون کی ساری آیتیں یہاں بیان کرنا مشکل ہے۔ میرا مقصد صرف اس قدر ہے کہ آپ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ سمجھ لیں کہ آپ کا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق کیا ہے۔ یہ بات ان چند آیتوں سے آپ کو معلوم ہوگئی جو میں نے آپ کو سنائی ہیں۔ ان سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری نہ کرے۔ اگر حضور کوئی حکم دیں، اور اس کے جواب میں آدمی کہے کہ میں اس کو نہیں مانتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دل میں ایمان ہی نہیں رکھتا۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ حکم سنے اور سیدھی طرح سر جھکا دے۔ چوں اور چرا کے ساتھ ایمان نہیں رہ سکتا۔

اچھا اب سنتے جائیے کہ حضور نے خدا کی طرف سے آپ کو کیا احکام دیے ہیں۔ پھر ہر شخص اپنی اپنی جگہ سوچتا جائے کہ وہ کتنا مسلمان ہے، اور کتنا ایمان اپنے دل میں رکھتا ہے۔

حضور کا ارشاد ہے کہ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ مسلمان وہ ہے

جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں یعنی جو نہ زبان سے اپنے مسلمان بھائیوں کو تکلیف دے اور نہ ہاتھ سے۔

آپ نے فرمایا۔ لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ تم میں سے کوئی شخص با ایمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی بات پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ یعنی جس طرح تم خود اپنی بھلائی چاہتے ہو اسی طرح اپنے مسلمان بھائی کی بھی بھلائی چاہو۔ اور جس طرح تم اپنی برائی نہیں چاہتے اسی طرح اپنے بھائی کی بھی برائی نہ چاہو۔

حضرت ابوذر غفاری بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص سے میرا کچھ جھگڑا ہو گیا اور میری زبان سے ماں کی گالی نکل گئی۔ حضور نے سن لیا اور فرمایا کہ انک امرؤ فیک جاھلیۃ۔ تم میں اب تک جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ پوری طرح اسلام نہیں آیا۔

حضور کا فرمان ہے کہ منافق کی چار خصلتیں ہیں۔ جس میں چاروں موجود ہوں وہ پورا منافق ہے۔ اور جس میں کوئی ایک خصلت ہو اس میں ایک حصہ نفاق کا بھی ہے۔ پہلی خصلت یہ ہے کہ جب اس پر بھروسہ کر کے کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔ دوسری خصلت یہ ہے کہ جب وہ بات کرے تو اس میں جھوٹ ضرور ملائے۔ تیسری خصلت یہ ہے کہ جب وہ کسی سے وعدہ یا عہد و پیمان کرے تو اس سے پھر جائے۔ چوتھی خصلت یہ ہے کہ جب کسی سے اس کا جھگڑا ہو تو وہ بد کلامی پر اتر آئے یا اپنے مخالف کو ناجائز طریقوں سے نیچا دکھانے کی کوشش کرے۔

آپ نے فرمایا کہ المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا یسلمہ ومن کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ ومن فرج عن مسلم کربۃ فرج اللہ عنہ کربۃ من کربات یوم القیمۃ ومن ستر مسلما سترہ اللہ یوم القیمۃ۔ یعنی مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ نہ تو خود ظلم کرے گا اور نہ اس کو کسی ظالم کے حوالہ کرے گا۔ جو شخص اپنے کسی بھائی کی حاجت

پوری کرنے میں لگا ہو، اللہ بھی اس کی حاجت پوری کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اور جو شخص کسی مسلمان کو کسی مصیبت سے بچائے گا اللہ اس پر روزِ حشر کی تکلیفوں میں سے ایک تکلیف کم کر دے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کا عیب چھپائے گا اللہ بھی قیامت کے روز اس کا عیب چھپائے گا۔

حضور نے فرمایا "اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم"۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ ہم مظلوم کی مدد تو کریں گے۔ مگر ظالم کی مدد کیسے کریں؟ فرمایا اپنے ظالم بھائی کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ پکڑ لو تاکہ وہ ظلم نہ کر سکے۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ اتق دعوة المظلوم فانها ليس بينها وبين الله حجاب۔ مظلوم کی بددعا سے ڈرو کیونکہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔ یعنی وہ سیدھی عرشِ الٰہی تک پہنچتی ہے۔

حضور کا ارشاد ہے کہ جس نے اپنے کسی بھائی کی حق تلفی کی ہو یا اس کی عزت یا اس کے مال یا کسی اور چیز کو نقصان پہنچایا ہو وہ اسی دنیا ہی کی زندگی میں اس کی تلافی کر دے ورنہ اگر اس دن پر اٹھا رکھا جس میں روپیہ پیسہ کچھ نہ ہوگا۔ بلکہ انسان کے پاس صرف اعمال ہی اعمال ہوں گے تو اس دن اسے یا تو اپنے نیک اعمال میں سے اس کو بدلہ دینا ہوگا، یا پھر مظلوم کے گناہوں میں سے کچھ بوجھ اس پر سے اتار کر ظالم پر ڈال دیا جائے گا۔

آپ نے فرمایا کہ جس نے کسی کی بالشت بھر زمین بھی مار لی اس کے گلے میں قیامت کے روز سات زمینوں کا طوق ڈالا جائے گا۔

حضور نے فرمایا کہ تین گناہ سب سے بڑے ہیں۔ ایک خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرنا۔ دوسرے والدین کی نافرمانی اور ان کے حق سے بے پروائی کرنا۔ تیسرے جھوٹ بولنا اور جھوٹی گواہی دینا۔

حضور نے فرمایا کہ جبریل نے ہمسایہ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کے لیے مجھ سے اتنی بار کہا کہ مجھے شک ہونے لگا کہ کہیں ہمسایہ کو وراثت میں شریک تو نہیں کر دیا جائے گا۔ ایک دوسری حدیث میں حضور نے فرمایا کہ وہ شخص ہرگز ایمان نہیں رکھتا، ہرگز ایمان نہیں رکھتا، ہرگز ایمان نہیں رکھتا جس کا ہمسایہ اس کی شرارت سے ڈرتا ہو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا جو شخص ایمان رکھتا ہو وہ اپنے ہمسایہ کو تکلیف نہ دے، اپنے مہمان کے ساتھ عزت سے پیش

آئے، اور جیب زبان کھولے تو بھلائی کے لیے کھولے ورنہ چپ رہے۔

حضور نے فرمایا کہ قیامت کے روز خدا کے ہاں بدترین آدمیوں میں سے وہ شخص ہوگا جو دو منہ رکھتا ہو یعنی دو مخالف فریقوں میں سے ایک کے پاس جائے تو اس کی سی کہے اور دوسرے کے پاس جائے تو اس کی سی کہنے لگے۔ آدمی کے منہ پر کچھ بات کہے اور پیٹھ پیچھے کچھ اور کہے۔

حضور کا ارشاد ہے کہ بین العبد وبین الکفر ترک الصلوٰۃ۔ آدمی اور کفر کے درمیان ترک نماز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسلام سے کفر تک پہنچنے کے لیے ایک درجہ بیچ میں ہے اور وہ نماز چھوڑ دینے کا درجہ ہے۔ اگر تم نے نماز چھوڑ دی تو گویا تم کفر اور اسلام کے بیچ میں لٹک رہے ہو۔ ایک قدم آگے بڑھے اور کفر کی حد میں پہنچ گئے۔

ایک موقع پر حضور نے فرمایا کہ جو لوگ اذان کی آواز سن کر گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ ان کے گھروں میں آگ لگا دوں۔

نماز کی تاکید میں حدیثیں تو بہت ہیں، مگر صرف یہ دو حدیثیں میں نے آپ کو سنائی ہیں جن سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ حکم کیسا زبردست ہے اور اس کی نافرمانی کے معنی کیا ہیں۔ یہ بات تو اس فرض کے متعلق ہے جس سے آج کل مسلمان عام طور پر غافل ہو رہے ہیں۔ دوسری بات اُس گناہ کے متعلق بھی سن لو جو مسلمانوں کو سب سے زیادہ تباہ کر رہا ہے یعنی سود۔ حضور نے صاف فرمایا ہے کہ سود کا لینا، دینا، اس کی دستاویز لکھنا اور اس پر گواہی دینا، سب حرام ہیں، اور ان میں سے جو فعل بھی انسان کرے گا، اس کی سزا جہنم ہوگی۔

بھائیو، عید میلاد النبی آپ مناتے ہیں، بڑی خوشی کی بات ہے۔ مگر صرف اتنا عرض کروں گا کہ اپنے سردار کے دربار میں حاضر ہوتے وقت ذرا یہ بھی سوچ لیا کیجیے کہ کیا منہ لے کر ہم اس روحِ پاک کا سامنا کر رہے ہیں۔ ایک خادم سے معمولی قصور ہو جائے تو وہ اپنے صاحب کے سامنے جاتا ہوا ڈرتا ہے اور منہ چھپاتا پھرتا ہے۔ پھر کیا منہ لے کر ان کے سامنے جائیں جن کے ایک دو نہیں، خدا جانے کتنے فرمانوں کی روز خلاف ورزی کرتے ہیں۔ خدایا! مجھ کو بھی اپنے نبی کے اتباع کی توفیق دے اور میرے بھائیوں کو بھی۔

مطبوعات

دربارِ رسول ؐ کے فیصلے

مترجمہ ابو العرفان حکیم محمد عبد الرشید۔ عرفان منزل، بہاولپور۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ قیمت بلا جلد تین روپے۔ مجلد چار روپے۔

اسلامی قوانینِ شریعت کی روح سے واقف ہونے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ رسول اللہ اور خلفائے راشدین کے حضور میں جو مقدمات پیش ہوا کرتے تھے ان کو اور ان کے فیصلوں کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ ایسے فیصلوں کی ایک کثیر تعداد حدیث کے مجموعوں میں محفوظ ہے، مگر انھیں متفرق طور پر روایت کیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ انھیں یکجا کیا جاتا۔ عبداللہ محمد بن فرج المالکی کی تالیف "اقضیۃ الرسول" اس ضرورت کو نہایت خوبی سے پورا کرتی ہے۔ زیر نظر کتاب اسی کا اردو ترجمہ ہے جو حکیم عبد الرشید صاحب نے بڑی محنت اور عمدگی سے کیا ہے۔ کتاب تمام ظاہری اور باطنی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ اس کا مطالعہ ہم ہر مسلمان کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

اقبال کا مطالعہ

از سید نذیر نیازی۔ کتاب خانہ پنجاب۔ لاہور۔ قیمت عہ

یہ چار مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلے مضمون میں مصنف نے بتایا ہے کہ ان کے نزدیک اقبال کا مطالعہ کرتے وقت اس کی کن کن حیثیتوں کا ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ دوسرے مضمون کا عنوان "اقبال اور حکمائے فرنگ" ہے۔ تیسرے مضمون میں اقبال کے اپنے نظامِ فکر اور مغربی فلسفہ پر ان کی تنقید کو بیان کیا گیا ہے اور چوتھے مضمون میں اقبال کی آخری علالت اور وفات کا ذکر ہے۔

خطباتِ شبلی

شائع کردہ دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ زورِ تحریر اور قوتِ تقریر ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ لیکن مولانا شبلی اس سے

مستثنیٰ تھے۔ انشاپرداز کی حیثیت تو ان کی ابتدائی علمی زندگی ہی میں نمایاں تھی۔ لیکن جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تحریک سے وابستہ ہوئے اور خصوصاً اس کے بعد جب انھوں نے ندوۃ العلماء کے قیام کے لیے جدوجہد شروع کی تو اس وقت ان کے تقریر کے فطری ملکہ کو بھی نشوونما پانے کا پورا موقع ملا۔ فن خطابت کے لحاظ سے جو ایک اچھی تقریر کے لوازمات ہیں وہ سب ان کی تقاریر میں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ علمی شواہد اور تاریخی معلومات سے بھی خالی نہیں۔ زیر نظر مجموعہ خطبات میں زیادہ تر تقریریں ندوۃ العلماء کی تحریک سے متعلق ہیں۔

نقوش سلیمانی

از مولانا سید سلیمان ندوی۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔ قیمت مجلد سے

یہ مصنف کے اُن متفرق مقالات اور خطبات کا مجموعہ ہے جو اُردو زبان اور اُردو ادب سے متعلق ہیں۔ آخر میں چند مقدمات ہیں جو مصنف نے مختلف کتابوں کے لیے لکھے۔

صراط الحمید حصہ اول و دوم

از پروفیسر سلاح الدین محمد الیاس برنی۔ یہ دو مختلف حجوں کے حالاتِ سفر ہیں جو مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں لکھے ہیں۔ پہلی دفعہ جبکہ وہ عراق، شام، فلسطین سے ہوتے ہوئے حجاز گئے تھے اور دوسری دفعہ جبکہ انھوں نے اپنے والد مرحوم کے لیے حج بدل کیا۔ سیدھے حجاز گئے اور حج کر کے واپس آگئے۔ دونوں جلدوں میں سفر حج اور عام سیر و سیاحت کے لیے مفید معلومات اور ہدایات دی گئی ہیں۔ قیمت ہر دو حصہ عہ۔ ملنے کا پتہ: کمال احمد صاحب فاروقی۔ بیت السلام۔ حیدرآباد دکن۔

خدا کی باتیں

مترجمہ و مرتبہ مولانا احمد سعید صاحب۔ قیمت دو روپے۔ ضخامت ۲۹۸ صفحات

ملنے کا پتہ:۔ دینی بکڈپو۔ اردو بازار۔ دہلی۔

یہ مجموعہ احادیث قدسیہ کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ میں وہ احادیث بھی شامل ہیں جنھیں رسول اللہؐ نے عام احادیث قدسی کی طرح اللہ تعالیٰ سے براہ راست روایت تو نہیں کیا۔ لیکن اُن میں اللہ کے اقوال مذکور ہوئے ہیں۔

(صفحہ ۵۳ سے آگے)

اب مجھے اپنے خطبہ کے بنیادی سوالات میں سے آخری سوال پر کچھ گفتگو کرنی ہے، اور وہ یہ کہ آدمی جب قرآن کے اس دعوے کو تسلیم کرلے اور اس الدین پر ایمان لے آئے جس کے من جانب اللہ ہونے کا اطمینان اسے حاصل ہو گیا ہو، تو اس تسلیم کرنے اور ایمان لانے کے مقتضیات کیا ہیں۔

میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے معنی جھک جانے، سپر ڈال دینے، اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے ہیں۔ اس جھکاؤ، سپردگی اور سپر اندازی کے ساتھ خودرائی، خودمختاری اور فکر و عمل کی آزادی ہرگز نہیں نبھ سکتی جس دین پر بھی آپ ایمان لائیں، آپ کو اپنی پوری شخصیت اس کے حوالے کر دینی ہوگی، اپنی کسی چیز کو بھی آپ اس کی پیروی سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آپ کے دل اور دماغ کا دین ہو، آپ کی آنکھ اور کان کا دین ہو، آپ کے ہاتھ اور پاؤں کا دین ہو، آپ کے پیٹ اور دھڑ کا دین ہو، آپ کے قلم اور زبان کا دین ہو، آپ کے اوقات اور آپ کی محنتوں کا دین ہو، آپ کی سعی اور عمل کا دین ہو، غرض آپ کی شخصیت کا کوئی جزء اور پہلو بھی اس دین سے خارج نہ ہو۔ جس چیز کو بھی جتنا اور جس حیثیت سے آپ اس دین کے احاطہ سے باہر اور اس کی پیروی سے مستثنیٰ رکھیں گے، سمجھ لیجیے کہ اسی قدر آپ کے دعوائے ایمان میں جھوٹ شامل ہے، اور ہر راستی پسند انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کو جھوٹ سے پاک رکھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

پھر یہ بھی میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ انسانی زندگی ایک کل ہے جسے شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا پوری انسانی زندگی کا ایک ہی دین ہونا چاہیے۔ دو دو اور تین تین دینوں کی بیک وقت پیروی بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایمان کے ڈانواں ڈول اور عقلی فیصلہ کے مضطرب ہونے کا ثبوت ہے۔ جب فی الواقع کسی دین کے الدین ہونے کا اطمینان آپ حاصل کرلیں اور اس پر ایمان لے آئیں تو لامحالہ اس کو آپ کی زندگی کے تمام شعبوں کا دین ہونا چاہیے۔ اگر وہ شخصی حیثیت سے آپ کا دین ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہی آپ کے گھر کا دین بھی نہ ہو، آپ کی تربیت اولاد کا، آپ کی تعلیم اور آپ کے مدرسہ کا، آپ کے کاروبار اور کسب معاش کا، آپ کی مجلسی زندگی اور قومی طرز عمل کا، آپ کے تمدن اور سیاست کا، آپ کے ادب اور آرٹ کا دین بھی نہ ہو۔ جس طرح یہ بات محال ہے کہ ایک ایک موتی اپنی اپنی جگہ تو موتی ہو، مگر جب تسبیح کے رشتہ میں بہت سے

موتی منظم ہوں تو سب مل کر دانۂ نخود بن جائیں، اسی طرح یہ بات بھی میرے دماغ کو اپیل نہیں کرتی کہ انفرادی حیثیت سے تو ہم ایک دین کے پیرو ہوں مگر جب اپنی زندگی کو منظم کریں تو اس منظم زندگی کا کوئی پہلو اس دین کی پیروی سے مستثنیٰ رہ جائے۔

ان سب سے بڑھ کر ایمان کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ جس دین کے الدین ہونے پر آپ ایمان لائیں اس کی برکتوں سے اپنے ابنائے نوع کو بہرہ ور کرنے کی کوشش کریں اور آپ کی تمام سعی و جہد کا مرکز و محور یہ ہو کہ یہی الدین تمام دنیا کا دین بن جائے۔ جس طرح حق کی فطرت یہ ہے کہ وہ غالب ہو کر رہنا چاہتا ہے، اسی طرح حق پرستی کی بھی یہ عین فطرت ہے کہ وہ حق تو جان لینے کے بعد باطل پر اُسے غالب کرنے کی سعی کیے بغیر چین نہیں لے سکتی۔ جو شخص دیکھ رہا ہو کہ باطل ہر طرف زمین اور اُس کے باشندوں پر چھایا ہوا ہے اور پھر یہ منظر اس کے اندر کوئی بے کلی، کوئی چبھن، کوئی تڑپ پیدا نہیں کرتا، اس کے دل میں اگر حق پرستی ہے بھی تو سوئی ہوئی ہے۔ اسے فکر کرنی چاہیے کہ یہ نیند کا سکوت کہیں موت کے سکوت میں تبدیل نہ ہو جائے۔

سرورق پرنٹنگ پریس نیل روڈ لاہور میں طبع ہوا

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

حصّہ اوّل

اِسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات اور مستقبل کے امکانات پر ایک سبق آموز تبصرہ جس سے مُسلمانانِ ہند کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اسلئے قیمت بہت کم رکھی گئی ہے

حصّہ دوم

اِس حصہ میں ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر مُفصل تبصرہ کرکے بتایا گیا ہے کہ مُسلمانوں کی غفلت سے اِس وقت تک مُلک کے سیاسی تغیرات کس طرح اصُول اسلام اور مُسلمانوں کے قومی مُفاد کے خلاف ہوتے رہے ہیں اور یہ کہ اگر اب مسلمان اپنی قومی زندگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کونسی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ اِس کی قیمت بھی اشاعت عام کے لئے بہت کم رکھی گئی ہے :-

حصہ سوم

مسلمانوں کی موجودہ سیاسی کشمکش کا عملی حل کیا ہے۔ اسلامی حکومت کن اصولوں پر قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا اقدام کرنے والے گروہ کو کن اصولوں پر منظم کیا جا سکتا ہے، اور ان اصولوں پر جس قدر اعتراضات و شبہات کئے جا سکتے ہیں، ان کا جواب کیا ہے۔ یہ تمام باتیں اس حصہ میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔

قیمت حصہ اول	حصہ دوم	حصہ سوم	علاوہ
فی جلد ۱-۰-۰	فی جلد ۲-۰-۰	فی جلد ۱-۸-۰	محصول ڈاک

دفتر رسالہ ترجمان القرآن دار الاسلام، پٹھانکوٹ، (پنجاب)